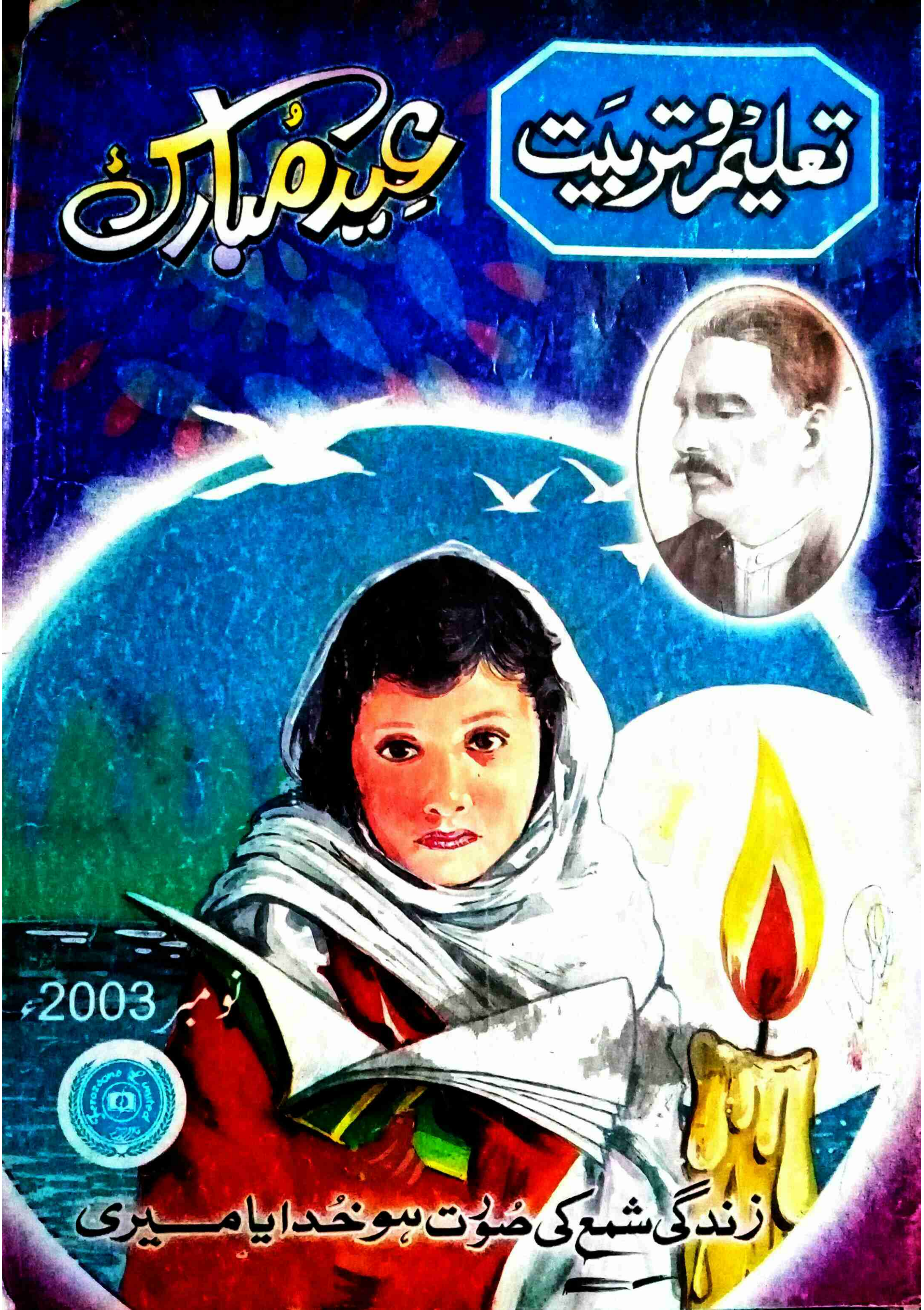

تعلیم و تربیت
عید مبارک
نومبر 2003ء
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

(رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی)

63واں سال۔ آٹھواں شمارہ   پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

چیف ایڈیٹر
عبدالسلام

ایڈیٹر/پبلشر
ظہیر سلام

مشیر خاص
سید مقبول حسین شاہ

مشیر
سعید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر
محمد جاوید امتیازی

آرٹ/ گرافکس
سید شوکت اعجاز

کولیشن اسسٹنٹ
محمد بشیر راہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

کہیے بچو، کیسے ہیں آپ! روزے رکھ رہے ہیں نا! بھئی یہ مہینا بڑی برکتوں والا مہینا ہے اس میں جتنی بھی عبادت کی جائے، کم ہے۔ نماز روزے کے ساتھ ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کا اہتمام بھی ضرور کریں۔ رمضان المبارک کے روزے ہمیں خداوند تعالیٰ کی سچی اطاعت کے علاوہ تحمل و بردباری، صبر و شکر اور زندگی کے ہر میدان میں ثابت قدم رہنے اور ہر حال میں اللہ کی طرف رجوع کرنے کا سبق دیتے ہیں...... یہ خصوصیات ہمیں ہمیشہ کے لیے اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں۔ ان مبارک دنوں میں نیکیاں اور دعائیں بدرجہ اولیٰ قبول ہوتی ہیں۔ آپ بڑے معصوم اور پیارے بچے ہیں، اس مہینے کی نسبت سے اپنے لیے، اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے لیے، دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وطن عزیز پاکستان کی ترقی و خوشحالی کے لیے خوب خوب دعائیں کیجیے...... اور ہاں اپنے پیارے "تعلیم و تربیت" کے لیے بھی کہ ہمہ دم اللہ کے فضل و کرم سے یونہی مقبولیت کی منزلیں طے کرتا رہے۔ اللہ آپ سب کو سلامت رکھے، آپ پھولوں کی طرح مہکتے مسکراتے اور چہکتے رہیں اور ہر قدم پر اعلیٰ کامیابیاں حاصل کریں۔ (آمین)

لو جی! میٹھی میٹھی عید بھی آ رہی ہے۔ ہماری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول کریں۔ بھئی عید تو صرف اسی کی ہے جس نے رمضان المبارک کا احترام کیا اور عید کی خوشیوں میں اپنے نادار بہن بھائیوں کو بھی شریک کیا۔ ہے نا صحیح بات! عید کے بعد ہمیں ضرور لکھیے گا کہ آپ نے رمضان شریف کیسے گزارا اور عید کی خوشیاں کیسے منائیں؟ ہم منتظر رہیں گے...... اب ہمیں اجازت دیں، باقی باتیں ان شاء اللہ آئندہ ماہ ہوں گی۔ بہت بہت دعاؤں کے ساتھ!......

(ایڈیٹر)

REHAN BOOK CENTRE
G-9 Markaz (Karachi Co.)
Islamabad. Ph: 285 13 14

آئندہ شمارے میں

عظیم فاتح

"میں کوئی ظالم و جابر فاتح نہیں۔ میں دکھیوں کا حامی ہوں اور انہیں ظالموں سے نجات دلانے کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں مسلمان ہوں اور اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ تمام مخلوق کا خالق اللہ ہے، جو ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ ظلم کرنا ایک بہت بڑا جرم ہے ہم مسلمان کسی پر زیادتی نہیں کرتے البتہ جو حق کا دشمن ہے، ہم اس کے دشمن ہیں"...... عظیم جرنیل اور فاتح محمد بن قاسم کے بارے میں دلچسپ کہانی پڑھیے جسے تحریر کیا ہے جناب ابو علی عبدالوکیل نے...... صرف اور صرف آپ کے لیے!

اس شمارے میں

ماہ رمضان کی آمد (نظم)	حکیم افتخار فخر	2
درسِ قرآن	ڈاکٹر عبدالرؤف	4
سب کچھ ملے گا!	نذیر انبالوی	5
معلوماتِ قرآن	جاوید امتیازی	9
احساسِ آگہی	عالیہ بخاری ہالہ	10
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری	اسد بخاری	13
علم (نظم)	عباس العزم	16
انتظار کیجیے!	حسن ذکی کاظمی	19
میرے پسندیدہ اشعار		24
پراسرار خزانہ	جنید احمد	25
کارٹون کہانی	شاہد ریاض شاہد	28
حیران کن	سید شوکت اعجاز	29
گولف (کھیل اور کھلاڑی)	سید شوکت اعجاز	32
جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ	جاوید امتیازی	36
صحراؤں کی سرزمین (11)	ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب	37
آپ بھی لکھیے		41
اچھے ابو!	اے ایم زاہد	43
لٹیرا	علی اکمل تصور	45
رہتاس کی سیر	فرحت جبیں	49
صحت کی حفاظت	جاوید امتیازی	52
روحوں کے رشتے	اسما ہارون	53
نیٹ ورک (10)	منظر رضا ہاشمی	59

اور بہت سے دوسرے دلچسپ سلسلے

سرورق: عید مبارک

نومبر 2003ء

قیمت فی پرچہ: 15 روپے

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور
U.A.N: 042-111-62-62-62 Fax: 042-6369204
Email: support@ferozsons.com.pk
Website: http://www.taleemotarbiat.com

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بنک ڈرافٹ، چیک یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32، ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر پیشگی ارسال کریں۔
فون: 6361309-6361310-6278815 فیکس: 6278816

سالانہ قیمت: پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =750 روپے۔
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =830 روپے۔
امریکا اور مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) =950 روپے۔

پرنٹر: عبدالسلام: مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60۔ شاہراہ قائداعظم لاہور

آمدِ رمضان المبارک

سکھائے ہم کو جینے کا قرینہ
کہ پھر آیا ہے رمضاں کا مہینہ

ہر اک سو ضوفشاں ہے کبریائی
کہ قرآں جس کی دیتا ہے گواہی

برس کا ہے یہی اک ماہِ حاصل
اسی میں تو ہوا قرآن نازل

بڑے روزے کی بچو ہے فضیلت
بہت افضل ہے رمضاں کی عبادت

مہینہ ہے یہ اونچی شان والا
ہے اس کی شب نرالی دن نرالا

نفس کے تزکیہ کا ہے مہینہ
ہزاروں نیکیوں کا ہے خزینہ

برائی اور غیبت سے بچائے
یہ سیدھی راہ صائم کو دکھائے

خدا کی نعمتوں میں ایک نعمت
کہ روزے سے بنی رہتی ہے صحت

جو روزہ رکھے وہ انعام پائے
سدا رحمت کا بادل اس پہ چھائے

جو روزے کی مشقت کو اٹھائیں
خدا سے پھر صلہ اس کا وہ پائیں

رکھو روزے دعا مانگو خدا سے
خوشی سے عید کی تم کو نوازے

یہ سچ ہے فخرؔ جو رکھتے ہیں روزے
وہی بچے ہیں سمجھو سب سے اچھے

حکیم افتخار فخر

قرینہ: طریقہ   ضوفشاں: روشن منور   کبریائی: اللہ کی قدرت اور بڑائی   تزکیہ: پاکیزگی، صفائی   صائم: روزے دار   فضیلت: رتبہ، مقام

درسِ قرآن

بچوں کے لئے

روزہ

ڈاکٹر عبدالرؤف

روزہ انسان میں نظم و ضبط اور اصلاح و ترقی کی ایک ایسی مفید تربیت ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو خصوصی تاکید فرمائی ہے۔ روزہ فرض ہونے کا اعلان قرآن حکیم کی دوسری سورت کی آیت نمبر 183 کے ان تین لفظوں سے واضح ہے۔

کُتِبَ عَلَیکُم الصِیَّام

(تم پر روزے فرض کر دیے گئے)

روزہ اسلام کا چوتھا ستون ہے۔ رمضان المبارک کے پورے مہینہ روزے رکھنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ روزہ ایک مقرر کردہ باضابطہ شیڈول ہے جو رات کو روزے کی نیت سے شروع ہوتا ہے۔ پھر عشاء کے ساتھ تراویح کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد صبح اذان فجر سے پہلے پہلے سحری میں جو کچھ بھی میسر ہو کھا پی لیا جاتا ہے۔ پھر مغرب کی اذان تک ہر قسم کے کھانے پینے سے قطعی پرہیز کیا جاتا ہے۔ دن بھر فرض نمازوں کی ادائیگی کے علاوہ جی بھر کے نفل پڑھے جاتے ہیں' حسب فرصت تلاوت قرآن کی جاتی ہے۔ روزہ دار اس مہینے خصوصاً ہر قسم کی برائی اور بدی سے بچے رہنے کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ روزہ گویا ایک بے انتہا مفید اور منظم ریفریشیر کورس کا مقام رکھتا ہے جو ہر روزہ دار کو اسلام اور انسانیت کے سنہرے اصولوں میں رنگ دینے کی ایک خوبصورت عملی تربیت کا کام دیتا ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں روزے سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے۔ ان میں یہ افراد شامل ہیں۔ (1) خواتین جو بحالت حمل ہوں یا چھوٹے بچوں کو دودھ پلانے والے دور سے گزر رہی ہوں (2) بیمار افراد (3) بہت بوڑھے یا بہت کمزور و ناتواں افراد (4) مسافر مگر اپنی اس عارضی کیفیت کے خاتمے پر ان سب کو چھوڑے ہوئے روزے رکھنے پڑتے ہیں یا نہ رکھنے کی صورت میں مقرر کردہ کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔

رمضان المبارک کے فرض روزوں کے علاوہ کسی روز بھی نفلی روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان پانچ دنوں میں کسی قسم کا کوئی روزہ رکھنا بالکل منع ہے۔ (1) پہلی شوال یعنی عیدالفطر (2) دسویں ذی الحجہ یعنی عید الاضحیٰ (3) 11' 12 اور 13 ذوالحجہ کے تین دن۔

روزہ اخلاق و کردار سنوارنے کی ایک مفید ترین مشق ہے۔ اس کے فائدوں کا کوئی شمار نہیں۔ چند غیر معمولی فائدے یہ ہیں۔ (1) مفید جسمانی اور روحانی تربیت (2) غریبوں اور ناداروں کی مفلسی کا شدت سے احساس اور دنیا سے افلاس و تنگ دستی کے خاتمہ کی تحریک اور عزم (3) ایک ایسے بڑے اور غیر معمولی ثواب کی تحصیل جس کے بارے میں قرآن و حدیث میں بار بار تاکید ہوئی ہے۔

☆☆☆

سب کچھ ملے گا!

نذیر انبالوی

ایک آواز صبح سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں یہ آواز میرا پیچھا کرتی ہے۔ صبح یہ آواز پہلی بار اس وقت مجھے سنائی دی تھی جب میں بس میں سوار سکول جا رہا تھا۔ بس کا کنڈیکٹر خواتین والے گیٹ میں کھڑا تھا۔ جب تک وہ بس کے پچھلے حصے میں آیا میرا سٹاپ آچکا تھا۔ بس رکتے ہی میں تیزی سے نیچے اترا تو کنڈیکٹر نے مجھ سے پوچھا تھا:

"ٹکٹ"

"ٹکٹ لے لیا ہے" میں نے جھٹ جواب دیا۔

سٹاپ سے سکول کا فاصلہ تھوڑا ہی تھا۔ میں سکول کی طرف جا رہا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں میں پڑی۔ "کچھ نہیں ملے گا"۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی بھی تو نہ تھا۔ میں سکول میں داخل ہوا تو گھنٹی بج رہی تھی۔ میں بستہ اپنی جماعت میں رکھ کر اسمبلی کی طرف بڑھا۔ اساتذہ طلبہ کو قطاروں میں کھڑا کرنے میں مصروف تھے۔ میں تیسری قطار میں کھڑا ہو گیا۔ میری نظر اپنے پاؤں میں گرے ہوئے ایک پین پر پڑی۔ میں نے تیزی سے جھک کر پین اٹھایا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ کسی نے میری اس حرکت کو نہیں دیکھا تھا۔ اسمبلی کے بعد جماعتوں میں جاتے ہوئے ایک طالب علم نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ اسمبلی میں میرے پیچھے کھڑے ہوئے تھے کیا آپ نے میرا پین تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں تو میں نے پین دیکھا ہوتا تو آپ کو فوراً دے دیتا"۔ میرا جواب سن کر طالب علم کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ جماعت کے کمرے تک جاتے ہوئے پھر ایک آواز میرے کانوں میں آئی:

"کچھ نہیں ملے گا"۔

میں نے اپنے پیچھے آتے ایک لڑکے سے پوچھا:

"کیا تم نے مجھ سے کچھ کہا ہے؟"

"نہیں تو" لڑکا بولا۔

جب تیسرا پیریڈ شروع ہوا تو سر کامران نے جماعت میں آتے ہی طلبہ کو مخاطب کیا:

"سب بچے ریاضی کی کاپیاں نکال

کر اپنے سامنے رکھ لیں"۔

یہ سن کر میرا سر چکرانے لگا کیونکہ میں نے ریاضی کا کام نہیں کیا تھا۔ جب میری باری آئی تو میں نے معصوم سی صورت بنا کر کہا:

"سر میں کام نہیں کر سکا"۔

"وہ کیوں؟"

"سر کل میرا چھوٹا بھائی شدید بیمار ہو گیا تھا۔ میں اپنی امی کے ساتھ اسے ہسپتال لے کر گیا تھا"۔

"اب تمہارے بھائی کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب بھائی کی طبیعت خاصی بہتر ہے"۔

"اچھا کل کام کر کے ضرور آنا"۔

"جی سر! میں ضرور کام کر کے آؤں گا"۔ میرے جھوٹ نے مجھے ٹیچر کے موٹے ڈنڈے سے بچا لیا تھا۔ میں واپس اپنی جگہ پر بیٹھا تو میرے کانوں نے یہ آواز سنی:

"کچھ نہیں ملے گا"۔

میرے ساتھ بیٹھا لڑکا خاموشی سے اپنا کام کرنے میں مصروف تھا اس لیے میں سمجھ گیا کہ یہ آواز اس کی نہیں تھی۔ سکول سے گھر آکر میں نے ظہر کی نماز پڑھی اور تین بجے اپنے دوست تنویر کے ساتھ ٹیوشن پڑھنے کے لیے چلا گیا۔ جب ہم بڑی گلی میں پہنچے تو میں نے تنویر سے کہا:

"ایک تماشا دیکھو"۔

"کیسا تماشا؟" تنویر نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے کی بجائے گلی کے آخری گھر کی بیل پر انگلی رکھ دی۔

"تم نے کیا کیا ہے؟"

"تم دیکھتے جاؤ ہوتا کیا ہے" میرا جملہ مکمل ہی ہوا تھا کہ ایک بوڑھے کی آواز انہیں سنائی دی"۔

"کون ہے؟"

"بابا انگور والا" میرا اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بابا ایک ڈنڈا لے کر باہر آ گیا۔ میرا دوست ساری بات جان چکا تھا۔ محلے بھر کے بچے بابا کو بابا انگور کہہ کر تنگ کرتے تھے۔ ڈنڈا دیکھ کر میں اور میرا دوست سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ دوسری گلی میں ایک شخص نے یہ کہتے ہوئے ہمارا راستہ روکا:

"بابا قیوم کی بیل تم نے بجائی تھی؟"

"نہیں تو...... ہم کیوں بابا انگور کے گھر کی بیل بجانے لگے"۔ میری بات سن کر اس شخص نے فوراً کہا۔ "بابا انگور نہیں بابا قیوم کہو"۔

ہم نے بابا قیوم کے گھر کی بل نہیں بجائی۔ میرا اتنا کہنے پر اس نے ہمارا راستہ چھوڑ دیا۔ ہم چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ تنویر نے کہا:

"تم نے جھوٹ بولا ہے"۔

"تو کیا سچ بول کر مار کھا لیتا"۔

"جاوید بہت بری بات...... بابا جی کو بھی تنگ کیا اور جھوٹ بھی بولا"۔

میاں جی نصیحتیں مت کرو۔ ایسی باتوں ہی سے زندگی میں مزا ہے"۔ تنویر نے میری بات سن کر مجھے ناخوشگوار انداز میں

گھورا۔ اسی لمحے مجھے پھر یوں لگا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے:

"کچھ نہیں ملے گا"۔

ٹیوشن سے فارغ ہونے تک عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ گھر آکر عصر کی نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے نکلا تو پچھلی گلی کا ایک لڑکا مل گیا۔ وہ ویڈیو گیم کھیلنے کے لیے جا رہا تھا۔ اس نے دس روپے کا نوٹ لہراتے ہوئے کہا:

"آجاؤ تمہارے پیسے بھی میں دوں گا"۔

اب مجھے بھلا اور کیا چاہیے تھا۔ مسجد کی بجائے میں ویڈیو گیم کی دکان میں موجود تھا۔ جب دس روپے ختم ہوئے تو ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ نماز پڑھنے میں اتنی دیر تو نہیں لگتی، یہی وجہ تھی کہ جب میں گھر پہنچا تو امی جان نے پوچھا:

"جاوید بیٹا اتنی دیر کہاں لگا دی تم نے؟"

"امی جان نماز کے بعد مولانا صاحب درس قرآن دینے لگ گئے تھے" میں نے فوراً جھوٹ گھڑا۔ امی جان نے میری بات کا اعتبار کر لیا۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو پھر سارا دن تعاقب کرنے والی آواز مجھے سنائی دینے لگی:

"کچھ نہیں ملے گا"۔

میں اس آواز کو نظر انداز کر کے ایک ناول پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ چھ بجے کے قریب ابا جان آگئے۔ افطار سے تھوڑی دیر پہلے امی جان نے دسترخوان پر کھانے پینے کی چیزیں چن دیں۔

"کیوں میاں آج کا روزہ کیسا گزرا ہے؟" ابا جان نے پوچھا۔

"بہت اچھا، مجھے تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا"۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں اس روزے کا اجر عطا کرے"۔ ابا جان کے دعائیہ جملے پر پھر میرے کانوں نے یہ آواز سنی:

"کچھ نہیں ملے گا"۔

روزہ افطار ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ ریڈیو پر روزے کے بارے میں تقریر ہو رہی تھی۔ ایک موقع پر مقرر نے کہا "ہمارے پیارے نبی ﷺ کا ارشاد پاک ہے کہ جس نے جھوٹ بولا اور اس پر عمل نہ چھوڑا تو اللہ کو کچھ حاجت نہیں ہے کہ روزہ رکھ کر کھانا پینا چھوڑ دے"۔ اس حدیث مبارکہ کا مفہوم یہ ہے کہ جس نے روزہ رکھ کر بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑا اسے بھوک پیاس کے سوا

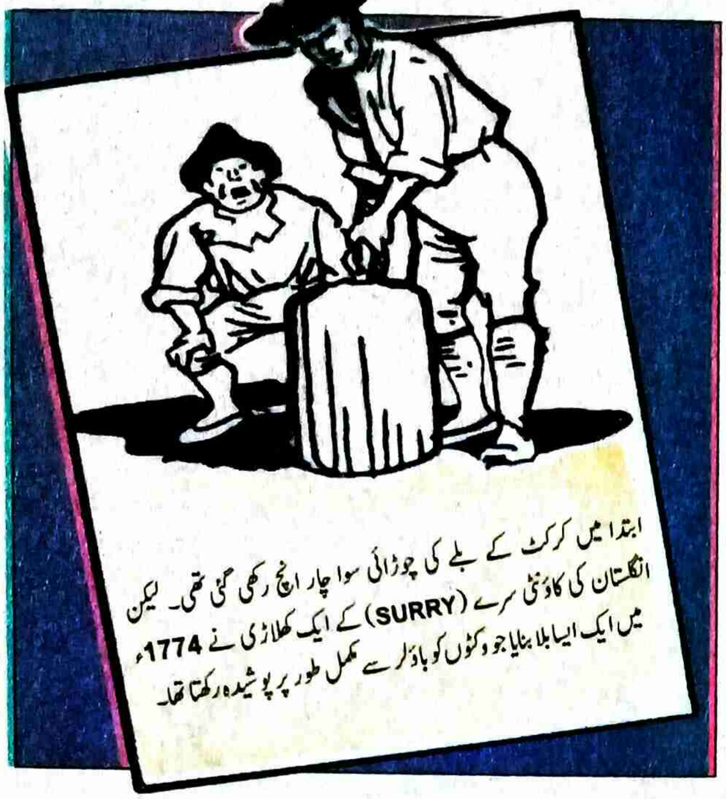

ابتدا میں کرکٹ کے بلے کی چوڑائی سوا چار انچ رکھی گئی تھی۔ لیکن انگلستان کی کاؤنٹی سرے (SURRY) کے ایک کھلاڑی نے 1774ء میں ایک ایسا بلا بنایا جو وکٹوں کو باؤلر سے مکمل طور پر پوشیدہ رکھتا تھا۔

کچھ نہیں ملے گا۔ تقریر کا ایک ایک لفظ میرے دماغ پر ہتھوڑا بن کر برس رہا تھا۔ سارا دن جس آواز نے میرا تعاقب کیا تھا اس کے بارے میں بھی مجھے علم ہو گیا تھا کہ وہ روزہ تھا۔ افطاری کا سائرن ہوا اور میں "کچھ نہیں ملے گا" کی آواز سنتے ہوئے کھجور کھانے لگا۔ میں نے آج اپنا سارا وقت ضائع کر دیا تھا۔

دوسرے دن میں بس میں سوار سکول جا رہا تھا۔ میں نے بس کنڈیکٹر سے کہا:

"دو ٹکٹ دے دیں"۔

"دوسرا کون ہے؟"

"دوسرا بھی میں ہی ہوں"

"کیا مطلب؟"

"میں نے کل بغیر ٹکٹ سفر کیا تھا"۔

کنڈیکٹر ساری بات جان گیا تھا۔ اس نے میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"شاباش بیٹا شاباش"

اسمبلی میں مجھے وہ لڑکا تلاش کرنے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی جس کا پین میں نے کل زمین سے اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

"پیارے دوست یہ تمہارا پین ہے میں نے کل جھوٹ بولا تھا کہ پین میرے پاس نہیں ہے"۔

لڑکے نے پین پکڑتے ہوئے کہا:

"اس پین کی وجہ سے کل مجھے ماسٹر صاحب سے مار بھی پڑی تھی"۔

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"پین نہ ہونے کی وجہ سے میں جماعت میں کام نہیں کر سکا۔ ماسٹر صاحب نے یہ سمجھا تھا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں کہ میرا پین گم ہو گیا ہے"۔ لڑکے کی زبانی یہ باتیں سن کر میرا سر شرم سے جھک گیا۔ میں نے معذرت کی اور خاموشی سے اپنی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ جماعت میں جب ریاضی کے کام چیک کروانے کی باری آئی تو میں نے اپنے کل کے جھوٹ سے سر کامران کے سامنے پردہ اٹھایا تو انہوں نے کہا:

"قابل رشک انسان وہی ہوتا ہے جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے آج سچ بولا ہے۔ اسی طرح سچ کا دامن تھامے رکھنا"۔

"اب بابا کی باری تھی۔ ٹیوشن جاتے ہوئے میں نے جب اچانک بابا قیوم کے گھر کے باہر لگی بیل پر ہاتھ رکھا تو تنویر چلایا:

"باز آجاؤ کل والی حرکت مت کرو"۔

"میں کل والی حرکت نہیں کر رہا"۔

"کون ہے؟" بابا قیوم نے پوچھا۔

"ہمیں بابا قیوم سے ملنا ہے"۔ یہ سن کر دروازہ کھلا تو میں نے اپنے کل والے جرم کا اعتراف کر لیا۔ بابا قیوم کو غصہ تو آیا مگر انہوں نے پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا:

"جاؤ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا"۔

تنویر بھی محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ عصر کی نماز کے لیے میرے قدم ویڈیو گیم کی دکان کی بجائے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نماز پڑھنے کے بعد میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ آج دن بھر کسی آواز نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ میں جب افطاری کے لیے دسترخوان پر بیٹھا تو ایک آواز میں نے سنی۔ یہ آواز آپ بھی سن لیں: "سب کچھ ملے گا...... سب کچھ ملے گا"

اچھے دوستو! بھلا یہ بتاؤ کہ "کچھ نہیں ملے گا" "سب کچھ ملے گا" میں کیوں کر تبدیل ہوا؟ جو درست جواب دے گا یقیناً اسے ہی "سب کچھ ملے گا"۔

☆☆☆

حقیقتِ حال

☆ ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً 8000 ملین سے تجاوز کر چکی ہے...... اور ہر روز دو لاکھ نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔

☆ دنیا کے تین بڑی آبادی والے ممالک چین (ایک ارب سے زائد) بھارت (تقریباً ایک ارب) اور امریکا ہیں۔

☆ زبانیں۔ اس وقت دنیا میں 5000 مختلف زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان چینی ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی زبان ہے۔ بول چال کے لحاظ سے انگریزی زبان سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ دنیا کی تقریباً ایک تہائی آبادی انگریزی بولتی ہے۔

☆ 1880ء میں ایک نئی بین الاقوامی زبان "امید" ESPERANTO(HOPE) ایجاد کی گئی۔ اس کے موجد کا خیال تھا کہ یہ نئی زبان دنیا میں امن و آشتی اور میل ملاپ کے لیے موثر ثابت ہو گی۔

معلوماتِ قرآن

قرآنِ حکیم اللہ رب العزت کی طرف سے نازل ہونے والی آخری اور مکمل کتاب ہدایت ہے جو ہمارے پیارے رسول نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر اتاری گئی۔ اس کی تعلیمات پورے عالم انسانی کے لیے ذریعہ نجات اور سامانِ ہدایت ہیں۔ نزول قرآن پاک کا آغاز رمضان کے آخری عشرے میں لیلۃ القدر کی مبارک رات میں ہوا۔ اس مناسبت سے اس کتابِ عظیم کے بارے میں چند مفید معلومات پیش کی جا رہی ہیں۔ قرآنِ پاک کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ آج تک یہ کتابِ ہدایت محفوظ و مامون ہے اور ہمیشہ انسانیت کو ہدایت کی روشنی عطا کرتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے اور اس کی تعلیمات پر پوری طرح عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

❀❀❀❀❀❀❀❀❀

- پہلی وحی...... اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ...... سورہ علق: آیت 1 تا 5
- آخری وحی...... اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا_ المائدہ 3
- قرآن پاک کی کل مدت نزول...... تقریباً 22 سال 5 ماہ۔
- پارے 30 منزلیں 7 سورتیں 114 رکوع 540 کل آیات 6666۔
- کل تعداد کلمات = 86430 چھیاسی ہزار چار سو تیس
- کل تعداد حروف = 323760 تین لاکھ تیئس ہزار سات سو ساٹھ۔
- جملہ کاتبانِ وحی = 40 صحابہ کرامؓ۔
- لفظ "اللہ" قرآنِ پاک میں 2697 بار آیا ہے
- اقسام آیات: آیات وعدہ = 1000 آیات وعید = 1000 آیات نہی 1000 آیات امر = 1000۔
آیاتِ مثال = 1000 آیاتِ قصص 1000 آیات تحلیل = 250 آیاتِ تحریم 250
آیاتِ تسبیح = 100 آیات متفرقہ = 66
- تفصیل حروفِ قرآن: الف = 48872 ب = 11428 ت = 1199 ث = 1276
ج = 3273 ح = 973 خ = 2416 د = 5602 ذ = 4677
ر = 11793 ز = 1590 س = 5991 ش = 2115 ص = 2012
ض = 1307 ط = 1277 ظ = 842 ع = 9220 غ = 2208
ف = 8499 ق = 6813 ک = 9500 ل = 3432 م = 36535
ن = 40190 و = 25536 ہ = 19070 ی = 45919۔
- کل حرکات (اعراب): فتحات (زبر) = 53223 کسرات (زیر) = 39582۔
ضمات (پیش ـُ) = 8804 مدآت ـٓ = 1771 تشدید (ـّ) = 1274 نقطے = 105684۔
- سجدہ ہائے تلاوت: متفق علیہ = 14 مقامات، اختلافی = 1 مقام۔

(سید محمد جاوید امتیازی)

ایک سبق آموز کہانی جسے آپ بھلانہ پائیں گے!

فضل الٰہی عرف پھجے نے چپکے سے جھانک کر دیکھا۔ اس کے سکول داخل ہونے کے بعد ابا تھکے تھکے قدموں سے واپس جا رہے تھے۔ ابا جونہی نظروں سے اوجھل ہوئے وہ چپکے سے اٹھا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا سکول سے باہر نکل آیا۔ چند منٹوں میں مکئی کی قد آدم فصل نے اسے اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔

احساسِ آگہی

عالیہ بخاری ہالہ

اس کے ساتھ کچھ اچھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے سکول جانا پسند نہیں تھا اور آج تو موسم بھی بہت حسین تھا۔ کالی گھٹائیں اُمڈی چلی آرہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ نمبرداروں کے باغ میں جھومتے جامنوں سے لدے درخت یاد آئے تو منہ میں پانی بھر آیا۔ اُف...... پکے جامنوں کی تو برسات ہو رہی ہو گی۔ اس وقت اماں نے نہلا دھلا کر صاف وردی پہنائی تھی۔ اُسے...... گھی سے تر بتر چوری کھلا کر ایک پراٹھے میں اچار کی پھانک رکھ کر دوپہر کے لیے بھی کھانا باندھ دیا تھا۔ بال سنوار کے انہوں نے اسکا ماتھا چوما اور بستہ اور تختی تھما کر سکول کی طرف روانہ کر دیا تھا۔ وہ روز گھر سے سکول کے لیے نکلتا تھا مگر اکثر سکول نہیں جاتا تھا۔ کبھی نہر کا کنارہ، کبھی نمبرداروں کا باغ تو کبھی کماد اور مکئی کے کھیت اس کی منزل ہوتے۔ لیکن آج...... اُسے خبر نہیں تھی کہ ماسٹر جی کل شام ابا کو اس کی شکایت پہنچا چکے ہیں۔ حالانکہ گھر سے وہ مستقل سکول جا رہا تھا۔ ماسٹر جی تو پوچھنے آئے تھے کہ اس کے والدین نے اسے سکول سے کیوں ہٹا لیا ہے۔ لیکن اس کے ماں باپ پر یہ سن کر بجلی گر پڑی تھی۔ وہ تو روز اسے سکول بھیج رہے تھے۔ وہ غریب لوگ تھے۔ نہ ان کی زمین اپنی تھی نہ ڈھور ڈنگر۔ ابا سارا دن کھیتوں میں بیگار کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کے لیے اچھے مستقبل کے خواب دیکھتے تھے۔ اسی لیے مشکل سہہ کر بھی اسے پڑھا رہے تھے۔ کتابیں اور یونیفارم خریدتے تھے۔ اچھی خوراک کا بندوبست کرتے تھے۔ اکثر اس کے ماں باپ خود سوکھی روٹی کھاتے لیکن اس کو چوری اور پراٹھے کھلاتے، انہیں تو اس خبر سے دکھ پہنچنا ہی تھا۔

آج...... اسے معلوم نہ تھا کہ ابا صبح ہی سے اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہوا تھا کہ وہ نہر میں نہاتا، کیریاں کترتا یا بچوں کے ساتھ کھیلتا ابا کو اچانک نظر آگیا۔ کبھی انہوں نے ڈانٹ کر سمجھایا تو کبھی پیار سے سمجھا کر سکول چھوڑ آئے لیکن آج تو انہیں بہت ہی غم و غصہ تھا۔ تب ہی تو انہوں نے اچانک اسے جامنوں تلے آ پکڑا تھا اور پھر اسے اس کی تختی سے ہی دھنک کر رکھ دیا تھا۔ تختی ہی ٹوٹ گئی تو پھر ابا کو ہوش آیا۔ تختی پھینک کر انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیدھے سکول لے چلے۔ سکول کے گیٹ پر اس وقت چپڑاسی بابا نہیں تھا۔ کلاسیں ہو رہی تھیں۔ باہر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ابا کے مڑتے ہی وہ سکول کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ لگی لیموں کی باڑ کے پیچھے چھپ گیا اور ان کے نگاہ سے اوجھل ہوتے ہی سکول کے ساتھ پھیلے مکئی کے کھیتوں میں گھس گیا۔ اس وقت اس کو بہت غصہ آرہا تھا۔ اس کے ابا نے اسے اس طرح تو کبھی نہیں ڈانٹا یا مارا تھا۔ اگر وہ نہیں پڑھنا

چاہتا تھا تو ابا کو آخر کیا پڑی تھی! کتنے ہی بچے تو تھے ان کے گاؤں میں جو نہیں پڑھتے تھے۔ کھیتوں میں کام کرتے تھے اور کھیلتے تھے۔ بس اس نے کبھی بیگار نہیں کی تھی۔ شہزادوں کی طرح اس کے ناز اٹھاتے تھے۔ شاید اس نے تو کبھی مٹی کھود کر بھی نہ دیکھی تھی۔ لیکن اسے کھیتوں میں کام کرنا آسان لگتا تھا۔ ابا خود بھی تو سارا دن کھیتوں میں پھرتے تھے۔ انہیں خود پڑھنا پڑے، سارا دن کلاس میں بیٹھے رہنا پڑے تو پتا چلے۔ اس نے جل بھن کر سوچا۔

"اُف کیسے ڈانٹ رہے تھے اور مار رہے تھے! تختی تک ٹوٹ گئی۔ لیکن انہیں پتا نہیں کہ میں کتنا مضبوط ہوں۔ مجھے تو چوٹ لگی ہی نہیں۔ ارے میں آج کام پر لگ جاؤں ناں تو ابا کو بٹھا کر کھلا سکتا ہوں"۔ اس نے مرغے کی طرح سینہ پھلا کر سوچا۔ لیکن وہ ابا کے چھوڑ کر آنے کے باوجود سکول سے بھاگ نکلا تھا۔ یہ تو کھلی بغاوت تھی۔ "ابا کبھی معاف نہیں کریں گے، تو نہ کریں۔ میں گھر ہی نہیں جاؤں گا۔ میں گاؤں سے ہی چلا جاؤں گا۔ گاؤں میں دیکھ کر تو ابا پھر پکڑ کر ماریں گے اور گھر بھی لے جائیں گے۔ اب نہ آیا میں ان کے ہاتھ اور نہ مار کھائی ان کی"۔ اماں کا دیا ہوا اچار پراٹھا کھاتے ہوئے وہ منصوبے بناتا رہا۔ پھر بستہ وہیں پھینک کر آہستہ آہستہ سٹیشن کی طرف چل دیا۔ ان کے گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے سٹیشن تھا۔ جہاں سے دن میں کوئی ایک آدھ ٹرین ہی گزرتی تھی۔ اس کا پروگرام تھا کہ وہ ٹرین پر بیٹھ کر کسی بڑے شہر میں چلا جائے گا۔ جہاں محنت مزدوری کر کے خوب پیسہ کمائے گا۔ پھر جب وہ گاؤں آئے گا تو اماں ابا دم بخود رہ جائیں گے۔

"بابو جی گاڑی کتنے بجے آئے گی....." اس نے دفتر میں اونگھتے ہوئے بوڑھے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ "چار بجے....." یہ کہہ کر وہ پھر اونگھنے لگا۔ اس وقت بارہ بجے تھے۔ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ پھجا باہر بینچ پر آ بیٹھا۔ وہ پہلی بار گاؤں سے نکلا تھا۔ ہر چیز اسے نئی اور دلچسپ لگ رہی تھی۔ وہاں دو آوارہ پلے کھیل رہے تھے۔ پھجا ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔ جانے کتنی دیر بعد..... بیل کی گھنٹیوں نے سٹیشن کا سکوت درہم برہم کر دیا۔ ایک موٹا سا کسان بیل گاڑی پر سبزیوں اور پھلوں کے کریٹ لادے آرہا تھا۔ بیل گاڑی روک کر

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں پھجے کے علاوہ کوئی بھی نہ تھا۔ "او لڑکے!" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ کریٹ اتار کر وہاں برآمدے میں رکھو"۔ اس نے رعب سے کہا..... "میں قلی تو نہیں ہوں"۔ پھجا واپس مڑا۔ "ٹھہر جا تیری تو....." ایک جھانپڑ اس کی گدی پر پڑا۔ پھجے کی آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے۔ وہ آدمی لاٹھی پکڑ کر بنچ پر جا بیٹھا اور پھجا گاڑی پر لدے بے شمار کریٹ ایک ایک کر کے برآمدے میں پہنچانے لگا۔

جانے کتنا وقت بیت گیا اس کام میں۔ ہاں گاڑی اس کے سامنے آئی اور چلی بھی گئی۔ جھانپڑ کے ڈر سے پھجا اس کسان کو یہ بھی نہ بتا سکا کہ وہ تو گاڑی میں بیٹھنے والا تھا اور بڑا آدمی بننے کے لیے دور دیس جانے والا تھا۔ وہ تھک کر چور ہو رہا تھا لیکن اس آدمی کی لاٹھی اور لال لال آنکھوں کے ڈر سے چپ چاپ کام کرتا رہا۔ کریٹ رکھتے اب تو شام ہو چکی تھی۔ اس کے قدم آپ ہی آپ گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ جب وہ گھر پہنچا تو چراغ جل چکے تھے۔ ابا تھکا ہارا چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اماں روٹی پکا رہی تھی۔ بھاجی کی خوشبو ہر طرف مہک رہی تھی۔ بھوک سے اس کی آنتیں اینٹھ

رہی تھیں۔ لیکن ابا کے ڈر سے وہ اندر جانے کے بجائے دروازے کے ساتھ بنے مرغیوں کے خالی ڈربے میں گھس گیا۔ "پھجا نہیں آیا...... اماں ہر پانچ منٹ بعد کہتی۔ کھیل رہا ہو گا کہیں...... روز اندھیرا ہونے تک وہ باہر ہی گھومتا رہتا ہے اس کا گھر گھسنے کو دل نہیں چاہتا"۔ وہ گویا خود سے باتیں کر رہی تھی۔ ابا خاموش تھے۔ "کھانا دوں......؟" روٹی پکا کر اماں نے پوچھا۔ "نہیں پھجا آلے۔ پھر مل کر کھاتے ہیں"۔ ابا بولے۔

"کیا بات ہے پھجے کے ابا...... تم کچھ پریشان ہو؟" اماں نے پاس بیٹھ کر پوچھا۔ شاید وہ کھیتوں میں ہونے والی کارروائی سے بے خبر تھی۔ "ہاں پھجے کی ماں"۔ ابا سیدھے ہو بیٹھے۔ "میں اسے مار تو نہیں رہا تھا صرف ڈرانا چاہتا تھا۔ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اسے پڑھنا چاہیے۔ پھر بھی...... مجھے ڈر ہے اسے چوٹ نہ لگی ہو......" ابا کی آواز میں گہرا کرب تھا۔

پھجے کو کسان کا مارا ہوا جھانپڑ یاد آ گیا۔ اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ اسے ابا کی مار سے چوٹ کیوں نہیں لگتی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ "پھجے کی ماں"۔ اس کے کانوں میں ابا کی دکھ بھری آواز پڑی۔ "وہ کیوں نہیں سمجھتا ہم اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ دیکھو......" انہوں نے اپنے ہاتھ اماں کے آگے پھیلا دیئے میں بیگار کرتا ہوں۔ کبھی کسی کے کھیتوں میں پانی دے دیا۔ پھل سبزیوں کے کریٹ ڈھو دیئے۔ ہل چلا دیا۔ دیکھو نکے کی ماں! میرے ہاتھوں میں روز آبلے پڑ جاتے ہیں۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے۔ ماسٹر جی کی طرح میز کرسی رکھ کر بیٹھے۔ لوگ اس کی عزت کریں۔ اسے بیگار نہ کرنی پڑے۔ اس کے ہاتھوں میں چھالے نہ پڑیں۔ لیکن وہ نہیں سمجھتا۔ پڑھے گا نہیں تو دوسروں کی نوکری کرنی ہی پڑے گی۔ جھڑکیاں سہنی ہی پڑیں گی۔ کبھی روزی ملے گی، کبھی نہیں ملے گی۔ ہاتھ پاؤں کے آبلے روز اس کا مقدر ہوں گے۔ تم ہی کہو میں اسے کیسے سمجھاؤں...... کیسے سمجھاؤں......؟" چراغ کی زرد روشنی میں ابا کی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ نکے نے اپنے ہاتھ دیکھے۔ کریٹ اٹھا اٹھا کر ان پر بھی چھالے پڑے ہوئے تھے اور کس قدر دکھ رہے تھے۔ روز اس اذیت سے گزرنے کے تصور سے ہی اسے جھرجھری آ گئی۔ گاؤں میں ان کی غربت کے باوجود کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ پھجے کو کام کہے یا بیگار بتائے۔ سب جانتے تھے کہ پھجے کا ابا اسے ماسٹر جی بنانا چاہتا ہے یا افسر بابو...... سب پیار سے اسے ابھی سے ماسٹر جی کہتے تھے۔ آج وہ ابا سے دور تھا تو ایک ظالم آدمی نے سارا دن اس سے مفت کی بیگار لی تھی۔ کہیں وہ شہر چلا جاتا۔ تو کون جانے وہاں کتنے ظالموں سے پالا پڑتا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے ابا اس سے کتنا پیار کرتے تھے۔ کتنے عظیم تھے وہ اور وہ کتنا ناسمجھ! اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنی تھکن سے چور ٹانگیں گھسیٹتا وہ باہر نکلا اور ابا کے قدموں میں آ بیٹھا۔ آج اسے احساس ہوا تھا کہ ابا کتنی محنت و مشقت کرتے ہیں۔ ان کا ہاتھ تھام کر اس نے اس پر اپنے لب رکھ دیئے۔ ابا مجھے معاف کر دیجئے۔ ابا آئندہ میں دل لگا کر پڑھوں گا۔ میں آپ کی ہر خواہش پر پورا اتروں گا۔ آئندہ کبھی سکول سے نہیں بھاگوں گا۔ ابا مجھے معاف کر دیجئے!!

☆☆☆

بچوں کے ادب کی پہلی کتاب

تاریخی اعتبار سے بچوں کے ادب کی پہلی کتاب 1477ء میں ولیم کیکسٹن نے "خوش خلقی" (A BOOK OF COURTESY) تیار کی تھی۔ اس میں خوش اخلاقی کا درس دیتے ہوئے بچوں کی تربیت اور تعمیر کردار کے لیے اچھے اور دلچسپ پیرائے میں مضمون لکھے گئے تھے۔

زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اسد بخاری

یوم اقبالؒ کی نسبت سے ایک ایکٹ کا خوبصورت ڈراما!

کردار

نورین (عمر 9 سے 11 سال)

فرحان (عمر 16 سے 17 سال)

(پردہ اٹھتا ہے)

مقام: ڈرائینگ روم

وقت: شام 4 بجے

کردار: نورین اور فرحان

منظر: ڈرائینگ روم کا سیٹ لگا ہوا ہے...... نورین ادھر ادھر ٹہل رہی ہے اور ایک مصرعہ بار بار دہرا رہی ہے، طرز کے ساتھ!

نورین: زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری!

ایک طرف سے نورین کا بھائی فرحان ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے اور وہ نورین کو یوں ٹہلتے ہوئے دیکھتا ہے جو بار بار ایک ہی مصرعہ پڑھ رہی ہے۔ فرحان حیران ہوتے ہوئے کہتا ہے۔

فرحان: ارے ارے بس رک جاؤ۔ کیا ہوا ایک ہی مصرعہ بار بار دہرا رہی ہو کیا اس سے آگے کچھ نہیں ہے؟

نورین: فرحان بھائی مجھے یہی مصرعہ اچھا لگتا ہے۔

فرحان: میری اچھی بہن علامہ اقبالؒ نے یہ دعا ہم بچوں کے لیے ہی لکھی تھی لیکن افسوس!

نورین: (فوراً بولی) افسوس کیسا بھائی...... میں کچھ سمجھی نہیں!

فرحان: دیکھو نا یہ دعا ہم روزانہ سکول کی سمری میں پڑھتے ہیں یقیناً تم لوگ بھی پڑھتے ہو گے لیکن اکثر بچوں کو اس کے مفہوم کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ اگر اس کی تشریح اور مطلب سمجھ میں آجائے تو بچوں میں مزید جوش و جذبہ پیدا ہو گا!

نورین: بات تو آپ کی ٹھیک ہے بھائی اگر آپ کو پتا ہے تو پلیز مجھے ضرور بتائیں میری یہ فیورٹ دعا ہے۔

فرحان: ہاں میں تمھیں بتاتا ہوں...... سامنے شیلف سے علامہ اقبالؒ کی شاعری کی کتاب بانگِ درا لے کر آؤ' اس میں پوری نظم ہے۔ میں تمھیں ہر مصرعے کے بارے میں مکمل تفصیل سے

بتاتا ہوں پھر تمہیں پتا چلے گا کہ علامہ اقبالؒ نے یہ نظم کیوں کہی تھی اور اس کا اصل مقصد کیا ہے!

(نورین شیلف کی طرف جاتی ہے اور وہاں سے کتاب لا کر بھائی کو دیتی ہے!)

نورین: یہ لیں بھائی کتاب!

فرحان: (کتاب کھول کر) لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری! نورین علامہ اقبالؒ نے کمسن طلبا کے لیے جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ نظم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں جس طالب علم کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ صحیح مسلمان اور سچا پاکستانی بچہ ہے۔ علم ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے اس لیے وہ علم کی شمع سے پروانے کی طرح محبت رکھتا ہے۔

نورین: واقعی بھائی۔ پلیز آگے بھی بتائیں نا!

(فرحان نے آگے کہا)

زندگی ہو میری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

نورین ہم لوگ علم کیوں حاصل کرتے ہیں بلکہ علم حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے؟ بس اس کا جواب اس دعا میں ہے کہ اچھا طالب علم خدا سے دعا کرتا ہے کہ اس کی زندگی شمع کی صورت ہو تاکہ وہ اس روشنی سے ہر طرف اجالا کر سکے۔ اس سے آگے علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

دور دنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

اس میں ہر جگہ کا لفظ غور طلب ہے۔ صرف اپنے لیے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے دعا کی گئی ہے۔

نورین: اگلا مصرعہ میں پڑھتی ہوں بھائی!

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

فرحان: ہاں تم نے غور کیا اس مصرعے پر کہ علامہ اقبالؒ نے دعا میں وطن کو نظرانداز نہیں کیا بلکہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وطن کی محبت اور خدمت تعلیم کے بنیادی مقاصد میں سے ہیں۔

محبت کا ایک مطلب ایثار اور احسان کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمیں اپنے ہم وطنوں، اپنے ساتھیوں، دوستوں اور پڑوسیوں سے اچھی طرح پیش آنا چاہیے۔ ان کے ساتھ اتفاق سے رہنا ہے۔ ہمدردی کرنا ہے اور قومی مفاد کو ملحوظ خاطر رکھنا ہے اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے اندر قومی شعور ہو۔ اس لیے قومی شعور کو بیدار کرنا اور اس کو ترقی دینا تعلیم کے اہم مقاصد میں سے ہے۔ قوم سے محبت کے سو طریقے ہو سکتے ہیں لیکن علامہ اقبالؒ نے قومی خدمت کے ایک اہم ذریعے کی خود وضاحت کر دی ہے:

نورین: وہ کیسے فرحان بھائی؟

فرحان: اس دعا کے اگلے شعر پر علامہؒ فرماتے ہیں:

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

دیکھو نورین اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمزوروں اور ضعیفوں کی مدد کرنا اور ان کے کام آنا بہت بڑی نیکی ہے اور یہی عین اسلام ہے۔ اس نظم کا آخری شعر یہ ہے کہ۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہے اس راہ پہ چلانا مجھ کو

اس نظم کا سب سے زیادہ خوبصورت اور معنی خیز حصہ یہی ہے یہ ہر مسلمان کی پہلی دعا ہے۔ نیکی کی تلاش اور برائی سے گریز یہی مومن کی پہچان ہے اور اس بارے میں قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

"اھدنا الصراط المستقیم"

مسلمان طالب علم برائی سے بچتا ہے اور جو نیکی کی راہ ہوتی ہے اس راہ پر چلتا ہے۔

نورین: زبردست فرحان بھائی زبردست! آج تو آپ نے کمال کر دیا۔ ہم روز سکول میں یہ نظم پڑھتے تھے لیکن آج تک اس کے اندر چھپے ہوئے مطلب اور معانی کا پتا نہ تھا۔

فرحان: ہمیں معلوم ہونا چاہیے بلکہ یہ ہمارے اساتذہ کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو آگاہ کریں اور اس راہ پر چلنے کے لیے طالب علم کی مدد کریں۔ یہی علامہ اقبالؒ چاہتے تھے!

نورین: فرحان بھائی آج کے بعد سکول میں دعا پڑھتے وقت

ساری باتوں کو ذہن میں رکھوں گی اور کوشش کروں گی کہ میں اپنی سہیلیوں کو اس دعا کے مطلب اور مفہوم کے بارے میں بتا سکوں ان شاء اللہ خود بھی اس پر عمل کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گی"۔

فرحان: نورین مجھے آج ایسا لگ رہا ہے کہ جو بات علامہ اقبالؒ بچوں تک پہنچانا چاہتے تھے آج پہنچ گئی ہے اور یقیناً ان کی روح خوش ہو رہی ہو گی۔ آؤ آج یومِ اقبالؒ پر مل کر عہد کرتے ہیں!

ہر دشت کو نغموں سے گلزار بنا جائیں
جس راہ سے ہم گزریں کچھ پھول کھلا جائیں

پسِ منظر میں آواز گونجتی ہے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

☆☆☆

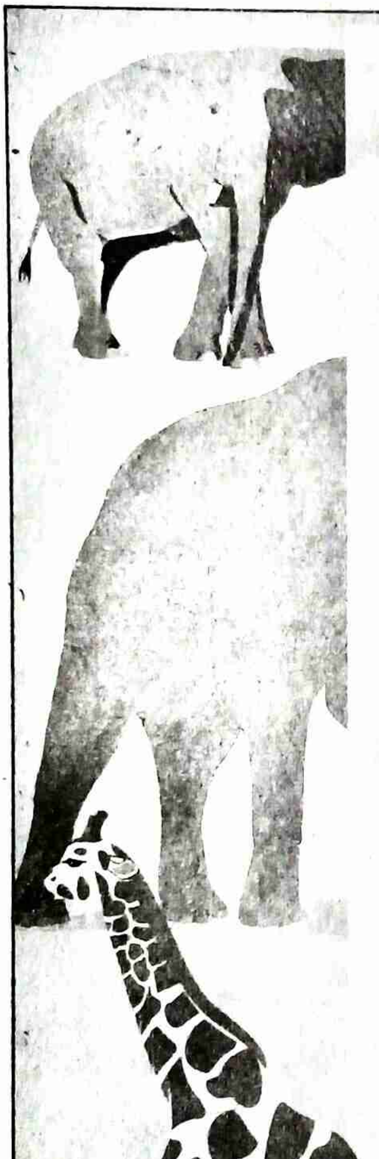

کیا آپ جانتے ہیں؟

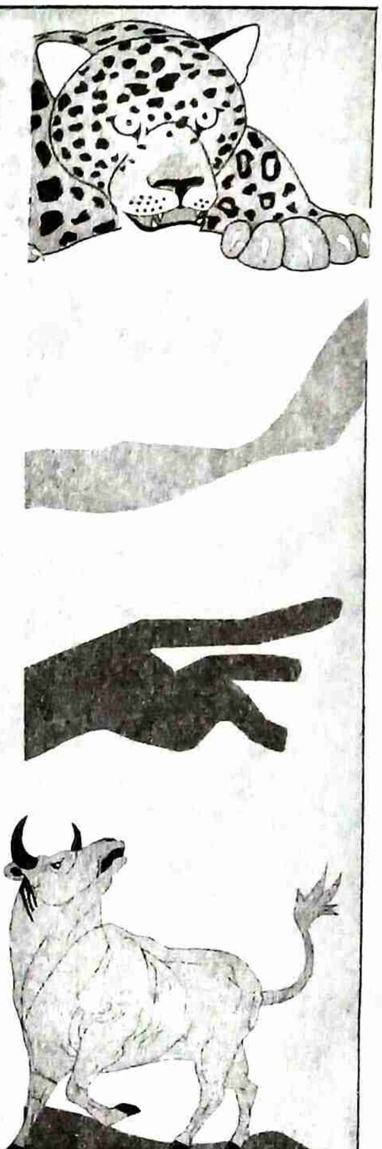

☆ براعظم افریقہ کے ہاتھیوں کا وزن 80، 90 تندرست و توانا مردوں کے برابر ہوتا ہے۔

☆ ہاتھی دنیا کا واحد جانور ہے جس کے چار گھٹنے (KNEES) ہوتے ہیں۔

☆ ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہاتھی تیر بھی سکتے ہیں۔ جی ہاں! ان کی تیرنے کی رفتار زیادہ سے زیادہ 2 میل فی گھنٹہ ہوتی ہے تاہم ہاتھی آپ کی طرح پانی میں ڈبکی یعنی ڈائیو (Dive) نہیں لگا سکتے۔

☆ برصغیر کے فیل بان (ہاتھیوں کے رکھوالے) ہاتھیوں کو قابو کرنے اور انہیں سدھانے کے لیے ایک ایسی قدیم زبان استعمال کرتے ہیں جو 1500 سال سے چلی آ رہی ہے۔

☆ چوپائیوں میں تیز ترین جانور چیتا ہے جو 70 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے شکار کا پیچھا کر سکتا ہے۔ یاد رہے کہ ایک تیز رفتار ریس کا گھوڑا زیادہ سے زیادہ 47 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہے۔

☆ سپین میں بھینسے کی لڑائی کا کھیل آپ نے فلم یا ٹی وی میں ضرور دیکھا ہو گا کہ جس میں کھلاڑی سرخ کپڑے سے بھینسے کو اشتعال دلاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھینسا Colour Blind ہوتا ہے۔ اس کی نظر بہت کم ہوتی ہے تاہم لہراتے ہوئے کپڑے سے وہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے حملہ آور ہوتا ہے۔

☆ زرافہ بالکل گونگا ہوتا ہے۔ وہ کسی قسم کی آواز نہیں نکال سکتا حالانکہ اس کی گردن کافی لمبی ہوتی ہے۔ تاہم گردن کی ہڈیاں صرف سات ہوتی ہیں جتنی کہ ایک چوہے کی۔

علم

عباس العزم

علم ہے خوش حالی کا باب — علم سے دنیا ہے شاداب
علم سے روشن بام و در — علم ہے عظمت کا محور
علم ہے زینہ رفعت کا — علم خزینہ دولت کا
علم ترقی کی بنیاد — علم سے صنعت کی ایجاد
علم سے فطرت کی تسخیر — علم سے دنیا کی تعمیر
علم سے انساں کی ہے شان — علم شرافت کی پہچان
علم سے روشن ہستی ہے — علم سے بستی، بستی ہے

علم حقیقی دولت ہے
علم خدا کی نعمت ہے

ایک مفت خورہ ایک دعوت میں بن بلائے چلا گیا۔ وہاں ایک آدمی نے پوچھا: "دولہا سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟" مفت خورے نے جواب دیا: "جناب! وہ میرے دوست کے دوست کے دوست ہیں۔

اس آدمی نے شوربہ سا اسے پلیٹ میں ڈال دیا۔

مفت خورے نے حیران ہو کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

آدمی نے جواب دیا: یہ شوربے کے شوربے کا شوربہ ہے۔

(زنیرہ، راولپنڈی)

ایک دفعہ ایک آدمی بہت جلدی میں کہیں جا رہا تھا۔ اس کے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وہ بس سٹاپ پر برابر والے آدمی سے پوچھنے لگا کہ: بھئی تمہاری بجی میں کیا گھڑا ہے؟ دوسرا آدمی اس سے بھی بہت جلدی میں تھا، اس نے کہا: "نونے یوں" (اویس بٹ امریکپورہ)

زاہد: ٹیکسی والے سے: "بازار جاؤ گے"۔

ٹیکسی والا: "جی ضرور"۔

زاہد: "پھر میرا منہ کیوں دیکھ رہے ہو جاؤ"۔

(فریحہ ظفر، رحیم یار خان)

ایک شخص (دوسرے سے) میرے پاس اتنے کپڑے ہیں کہ پہننے کو وقت ہی نہیں ملتا۔

دوسرا شخص: اچھا تو تم اتنے امیر ہو۔ ویسے تم کام کیا کرتے ہو۔

پہلا شخص: میں دھوبی ہوں۔ (مدیحہ شاہد فیصل آباد)

ایک پروفیسر صاحب کافی دیر یہی سوچتے رہے کہ آج انہوں نے کوئی کام کرنا تھا۔ آخر رات کے دو بجے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے آج جلدی سونا تھا۔

(عطیہ زہرا، ملتان)

دکاندار: آپ ریڈیو کی آدھی قیمت کیوں دینا چاہتے ہیں؟ یہ تو بالکل نیا ہے، سیکنڈ ہینڈ نہیں۔

گاہک: میں ایک کان سے بہرا ہوں۔ (اسد خان، بنوں)

فوجی پریڈ کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ ایک فوجی نے غلط قدم اٹھا لیا تو پریڈ کمانڈر غصے میں بولا "یہ کون بے وقوف ہے، جس نے دونوں پاؤں اوپر اٹھا رکھے ہیں"۔

(کوثر بانو، کراچی)

دو افیمی کہیں جا رہے تھے کہ اچانک ایک افیمی گٹر میں گر گیا۔

پہلا افیمی: دوست کہاں ہو؟

دوسرا افیمی: ارے گٹر میں ہوں۔

پہلا افیمی: دوست جہاں رہو خوش رہو۔

(وقار علی شاہ گڈو بیراج)

ماں نے اپنے 6 سالہ بچے کو انگلی پر پٹی باندھتے ہوئے دیکھا تو ہمدردی سے پوچھا "بیٹا! کیا بات ہے؟"

بیٹے نے جواب دیا: کچھ نہیں مجھے ہتھوڑی سے چوٹ لگ گئی ہے۔

ماں نے کہا: "تم روئے اور چلائے نہیں؟"

بیٹے نے معصومیت سے کہا "ممی! میں سمجھا کہ آپ باہر گئی ہوئی ہیں" (اویس بٹ امریک پورہ)

ایک شخص دوسرے سے: یار تم بتا رہے تھے کہ تم میں دو خوبیاں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔ بھلا کون کون سی۔

دوسرا: ایک تو اللہ نے حافظہ بہت اچھا دیا ہے اور دوسری ابھی یاد نہیں آ رہی۔ (توفیق اعظم، پشاور)

سائنس فکشن

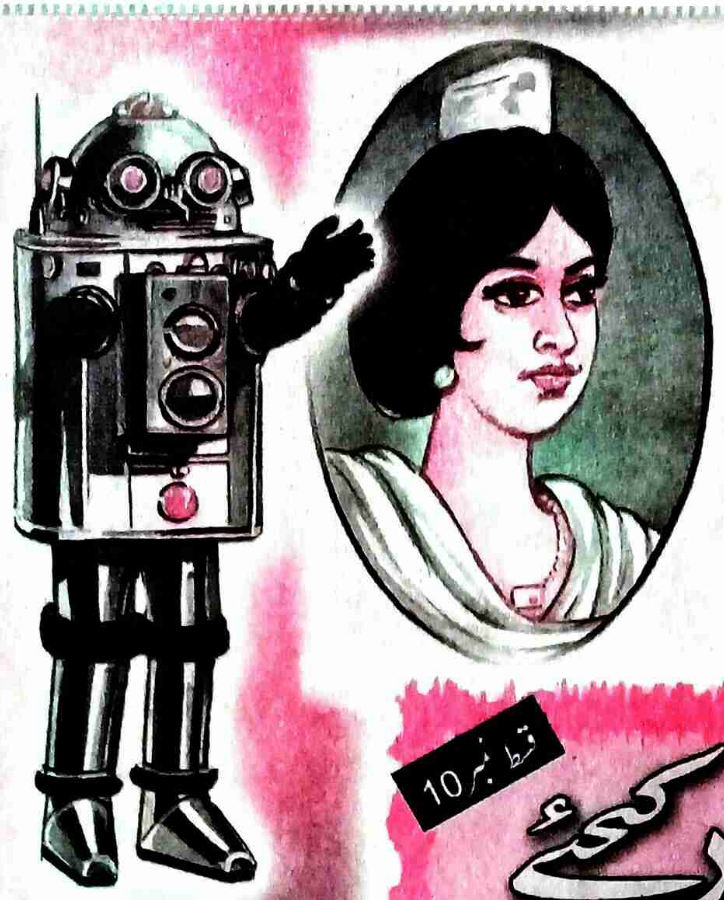

روبوٹ کہانی

حسن ذکی کاظمی

قسط نمبر 10

انتظار کیجیے

ممانی کو حمزہ کا روبوٹس ہوسٹل اور مسٹر میسن کے اپارٹمنٹ کے چکر لگانا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ حمزہ اپنا وقت گنوا رہا ہے اور پڑھائی کی طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی ہے۔ وہ یہ تو چاہتی تھیں کہ جیک ہفتہ دس دن میں آئے اور ان کے گھر کا کام کر جائے لیکن روبوٹس سے زیادہ دوستی کے حق میں نہ تھیں۔ البتہ ماموں ہمیشہ حمزہ کی ہمت بڑھاتے رہتے تھے۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ حمزہ ان بچوں میں نہیں جو اپنے وقت کی قدر نہیں کرتے۔

ماموں کو حمزہ نے پٹو کے بارے میں بتایا تو بہت خوش ہوئے اور انہوں نے بڑے اشتیاق سے کہا:

"ارے واہ...... پٹو تو کمال کا آدمی...... میرا مطلب ہے کمال کا روبوٹ ہے۔ بھئی ہماری بھی ملاقات کراؤ۔ کسی دن بلالو اسے چائے یا کھانے پر"۔

حمزہ کو ہنسی آگئی۔ وہ جلدی سے بولا "ماموں! آپ ہمیشہ بھول جاتے ہیں کہ روبوٹس کھاتے پیتے نہیں۔ وہ کوئی انسان تھوڑا ہی"۔

ماموں نے بات کاٹی "ٹھیک ہے یار...... نہیں کھاتے تو ان کی مرضی...... خالی خولی باتوں کے لیے ہی بلالو"۔

حمزہ نے جواب دیا "جی ضرور بلاؤں گا۔ تھوڑی دوستی ہو جائے اس سے...... ابھی تو میری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ کل چھٹی ہے تو اس سے ملنے جاؤں گا"۔

دوسرے دن حمزہ مسٹر میسن کے اپارٹمنٹ پہنچا تو وہ بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ اسے دیکھتے ہی بولے:

"بھئی حمزہ یہ تمہارا دوست پٹو تو واقعی بڑے کمال کی چیز ہے۔ مجھے تو بڑا آرام مل گیا اس کے آجانے سے۔ میرا کام بھی کرتا ہے دل بھی بہلاتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی یادداشت خوب ہے۔ ایک بار جو بات کہہ دو بس نقش ہو جاتی ہے۔ دوا اور کھانے کا وقت تو ایسے یاد رکھتا ہے کہ ایک منٹ ادھر سے ادھر نہیں ہوتا اور بھئی گاتا بھی خوب ہے۔ بتا رہا تھا کہ پیانو بھی بجاتا ہے"۔

مسٹر میسن نے موسیقی کا ذکر کیا تو حمزہ کو واسوبوٹ کا خیال آگیا جس کے بارے میں پٹو پچھلی ملاقات میں بتانے والا تھا لیکن بات ادھوری رہ گئی تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا:

"ارے ہاں پٹو! واسو بوٹ کے بارے میں تو بتاؤ۔ واسو بوٹ موسیقار کے بارے میں تم نے وعدہ کیا تھا کہ بتاؤ گے"۔

پٹو نے جوس کا گلاس اس کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں خوب یاد ہے: مسٹر میسن! آپ کو کوئی کام تو نہیں؟ میں تھوڑی دیر حمزہ سے باتیں کر لوں"۔

مسٹر میسن بولے "ہاں ہاں...... ضرور باتیں کرو لیکن اسی کمرے میں بیٹھ کر۔ تمہاری باتیں سن کر میری معلومات بھی زیادہ ہوں"۔

حمزہ نے ذرا شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "مسٹر میسن آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ بزرگ ہیں اور ایک عالم۔ ہم تو بچے ہیں۔ بھلا آپ کی معلومات ہماری باتوں سے کیسے بڑھ سکتی ہیں"۔

مسٹر میسن نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"بیٹھ جاؤ...... برخوردار...... بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں ایک اہم بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ بزرگی عمر سے نہیں ہوتی۔ عقل سے ہوتی ہے اور عقل تم سے زیادہ بھلا کس میں ہو گی؟ کیوں کہ تم......"

مسٹر میسن ابھی جملہ پورا نہیں کر پائے تھے کہ حمزہ زور سے بولا "کیونکہ میں بقراط ہوں"۔

مسٹر میسن نے قہقہہ لگایا اور پٹو سے مخاطب ہوئے: "ہاں بھئی پٹو بتاؤ واسو بوٹ کون تھا؟"

پٹو کہانی شروع کرنے ہی والا تھا کہ گھنٹی بجی...... پٹو نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور شہلا کمرے میں داخل ہوئی اور بولی:

"ہیلو مسٹر میسن' ہیلو حمزہ...... ہاؤ آر یو؟ حمزہ آج میرا ہاف ڈے تھا۔ سوچا مسٹر میسن سے ملاقات کر لی جائے۔ تمہارے گھر فون کیا کہ تمہیں بھی ساتھ لے لوں تو پتا چلا کہ تم پہلے سے یہاں پہنچے ہوئے ہو"۔

حمزہ نے اشارے سے شہلا کو بیٹھنے کے لیے کہا اور پھر پٹو سے بولا "لو بھئی اب سسٹر شہلا بھی آ گئیں۔ اب سنا ہی دو واسو بوٹ کی کہانی"۔

پٹو نے دیکھا کہ وہ سب کی توجہ کا مرکز ہے تو اسے اپنی بہت اہمیت محسوس ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر بولنا شروع کیا:

"یہ تو آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ 1941ء میں گاما۔۳ نے پیرس میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا اور یہ بات مارچ 1985ء کی ہے کہ جاپان میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایک نمائش کے دوران واسو بوٹ نے پیانو پر اپنا کمال دکھایا۔ واسو بوٹ ایک روبوٹ تھا۔ واسو بوٹ میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ کاغذ پر لکھی ہوئی نوٹیشن یا اسکور پڑھ سکتا تھا اور دوسرے موسیقاروں کا ساتھ دے سکتا تھا یعنی واسو بوٹ میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ وہ پڑھ سکے اور دیکھ سکے...... اور سن بھی سکے۔ اسی لیے تو وہ دوسرے ساز بجانے والوں کا آسانی سے ساتھ دے سکتا تھا۔ اسی لے اور تال میں رہتا اور جب یہ لے تال بدلتی تو وہ بھی اپنی لے تال بدل لیتا اور ان کے ساتھ مل جاتا۔ واسو بوٹ جاپانی سائنس دانوں کی بیس بائیس سال کی محنت اور تحقیق کا نتیجہ تھا۔ 1985ء سے اب تک تقریباً پینتیس سال اور گزر گئے اور اب تو یہ حال ہے کہ انسان اور روبوٹ کی مہارت میں فرق محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تازہ مثال ماسٹر میلوڈی ہیں"۔

مسٹر میسن نے حیرت سے پٹو کو دیکھتے ہوئے کہا:

"بھئی تمہاری باتیں تو حیران کرنے والی ہیں...... لیکن بدقسمتی سے میں نے ماسٹر میلوڈی کو سنا ہی نہیں"۔

حمزہ جلدی سے بولا "تو کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ پٹو ماسٹر کو سن لیجیے"۔

پٹو نے گردن ہلائی "نہیں بالکل نہیں...... بہت فرق ہے ماسٹر میلوڈی میں اور مجھ میں وہ استاد ہیں...... میں تو بس ایسے ہی تھوڑا بہت گا لیتا ہوں یا ایک آدھ ساز بجا لیتا ہوں"۔

حمزہ جلدی سے بولا "ارے یار بنو مت...... وقت ضائع نہ کرو...... جلدی سے سناؤ"۔

پٹو نے شہلا کی طرف دیکھا تو وہ کہنے لگی "سنا دو پٹو...... یہ حمزہ اب سنے بغیر نہیں رہے گا"۔

پٹو اپنا ساز اٹھا لایا اور بڑے میٹھے انداز میں گانا شروع کیا۔ حمزہ سے زیادہ مسٹر میسن حیران تھے۔ کیونکہ ابھی تک انہوں نے نہ کسی روبوٹ کو گاتے سنا تھا اور نہ ہی کسی روبوٹ کی ریکارڈنگ سنی تھی۔ اُس کا گانا ختم ہوا تو تینوں نے خوب تالیاں بجا کر پٹو کی فنکاری کی داد دی۔ شہلا نے حمزہ اور مسٹر میسن کو بتایا:

"ماسٹر میلوڈی تو خیر استاد ہیں لیکن نئے روبوٹ فنکاروں میں پٹو کو بہت پسند کیا جا رہا ہے اور جلد ہی ان کی ریکارڈنگ ہونے والی ہے"۔

مسٹر میسن نے خوش ہو کر کہا "بھئی پھر تو میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اتنا اچھا روبوٹ فنکار میرے ساتھ رہ رہا ہے۔ لیکن یہ بات ٹھیک نہیں کہ اتنا بڑا فنکار میری خدمت کرے"۔

پٹو نے سر جھکا کر کہا "مسٹر میسن پہلی بات تو یہ کہ میرا شمار بڑے فنکاروں میں نہیں۔ دوسری بات یہ کہ آپ کی خدمت سے تو میری عزت بڑھے گی اور مجھے خوشی بھی ہو گی۔ سسٹر شہلا بتا رہی تھیں کہ آپ نے عمر بھر لوگوں کو اچھی اچھی باتیں سکھائی ہیں اور ان میں علم بانٹا ہے۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ میں تو سسٹر کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے آپ کے پاس پہنچا دیا"۔

حمزہ خوش ہو کر بولا "واہ میرے دوست...... تم تو باتیں بھی خوب کر لیتے ہو۔ اچھا وقت گزرے گا تمہارے ساتھ"۔

پھر ایک دم اسے کچھ خیال آیا اور وہ مسٹر میسن اور شہلا دونوں سے مخاطب ہو کر بولا "ارے یہ تو بتائیں کہ ڈاکٹر کوہی کی بھی کچھ خیر خبر ہے؟ میں نے دو بار فون کیا لیکن جواب ملا کہ وہ بے حد مصروف ہیں"۔

مسٹر میسن بولے: "مجھے بھی فون پر یہی جواب ملا۔ لیکن پھر ان کی سیکرٹری نے ای۔ میل پر یہ پیغام دیا تھا کہ وہ ویک اینڈ سے پہلے اپنا کام ختم کر لیں گے اور ملنے آئیں گے"۔

شہلا نے کہا "دراصل ڈاکٹر کوہی آج کل ایک خاص پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ شاید وہ ویک اینڈ تک ختم ہو جائے۔ ایک دو بار ہسپتال میں نظر بھی آئے لیکن بس ہیلو ہیلو ہوئی کوئی بات نہ ہو سکی۔ لیکن بقراط تمہیں ان کی تلاش کیوں ہے؟"

حمزہ نے ذرا حیرانی سے کہا "آپ بھی کمال کرتی ہیں سسٹر...... یاد نہیں پچھلی ملاقات میں انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس مریض کے بارے میں بتائیں گے جس کے دماغ کا آپریشن ہوا ہے"۔

"اچھا تو اس لیے پریشان ہو۔ خیر ویک اینڈ کون سا دور ہے"۔ یہ کہہ کر شہلا جانے کے لیے کھڑی ہو گئی اور حمزہ نے بھی مسٹر میسن اور پٹو سے اجازت لی۔

ویک اینڈ سے ایک دن پہلے یعنی جمعہ کو ڈاکٹر کوہی نے مسٹر میسن کو فون کیا اور بتایا کہ وہ کل صبح ان سے ملنے آئیں گے اور ان کے ایک مہمان جو باہر سے آئے ہوئے ہیں وہ بھی ساتھ ہوں

گے۔

"کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟" مسٹر میسن نے پوچھا۔

ڈاکٹر کوہی نے ہنستے ہوئے کہا "جو چاہیں سمجھیں...... میں تو اتنا بتا سکتا ہوں کہ انسان ہیں اور میرے مہمان ہیں"۔

ٹیلی فون پر باتیں کرنے کے بعد مسٹر میسن نے پٹو کو پاس بلایا اور ہدایات دینے لگے "دیکھو پٹو بیٹے! تھوڑی سی صفائی کر دینا اور یہ میری کتابیں جو بکھری پڑی ہیں انہیں سلیقے سے رکھ دینا اور ہاں نیچے اسٹور سے کچھ تازہ پھل لے آنا۔ وہ ڈاکٹر کوہی آئیں گے صبح"۔

پٹو نے حیران ہو کر پوچھا "ہائیں! کیا ڈاکٹر کوہی پھل کھانے لگے؟"

مسٹر میسن مسکرائے اور بولے "ارے نہیں...... بات دراصل یہ ہے کہ ان کے ساتھ ایک مہمان بھی ہوں گے جو انسان ہیں۔ ڈاکٹر کوہی کو ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ کسی طرح میری M.P.D کا علاج تلاش کر لیں۔ معلوم ہوتا ہے انہوں نے اس مرض کا کوئی ماہر تلاش کر لیا ہے"۔

دوسرے دن صبح ڈاکٹر کوہی اپنے مہمان کے ساتھ مسٹر میسن کے اپارٹمنٹ پہنچے تو پٹو انہیں لاؤنج میں ہی مل گیا۔ وہ کافی پریشان نظر آرہا تھا۔ ڈاکٹر کوہی اور مہمان کو سلام کرنے کے بعد وہ ڈاکٹر کوہی کے قریب گیا اور آہستہ سے بولا:

"ڈاکٹر! مسٹر میسن تو کافی دیر سے سولجر بنے کمرے میں مارچ کیے جا رہے ہیں۔ بس اتنا کہہ رہے ہیں کہ میں آزادی کی فوج کا سپاہی ہوں۔ مجھے بالکل نہیں پہچان رہے۔ کمرے سے نکال دیا ہے"۔

ڈاکٹر کوہی بھی پریشان ہو گئے۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں اپنے مہمان کو دیکھا۔ مہمان نے بڑے سکون سے کہا:

"پریشان نہ ہوں ڈاکٹر کوہی...... فکر نہ کیجئے۔ یہ تو مجبوری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں ان سے بات کرنا مناسب نہیں۔ پھر مل لیں گے۔ ہاں اگر ممکن ہو تو میں انہیں ایک نظر دیکھ لوں"۔

ڈاکٹر کوہی پٹو سے مخاطب ہوئے "کیوں بھئی پٹو از اٹ

پوسیبل"۔

پٹو نے کچھ سوچ کر کہا "جی بالکل ممکن ہے"۔ پھر وہ مہمان سے مخاطب ہوا۔ "ڈاکٹر کوہی یہاں لاؤنج میں بیٹھے رہیں۔ میں آپ کو پچھلے دروازے سے کچن میں لے چلتا ہوں۔ آپ ایسے ہی جھوٹ موٹ بجلی اور گیس کی فٹنگ چیک کرتے رہیے گا اور انہیں اور ان کی حالت کو اچھی طرح دیکھتے رہیے گا۔ میرا خیال ہے وہ آپ سے کچھ نہیں بولیں گے اور نہ ہی الجھیں گے"۔

ڈاکٹر کوہی بولے "گڈ آئیڈیا"۔

پٹو نے ڈاکٹر کوہی کا شکریہ ادا کیا اور مہمان کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ دونوں واپس آئے تو ڈاکٹر کوہی نے مہمان کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کچھ پوچھ رہے ہوں۔ مہمان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے ڈاکٹر کوہی کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا "میرا اندازہ درست معلوم ہوتا ہے۔ میں حیران بھی ہوں اور خوش بھی"۔

ڈاکٹر کوہی اور مہمان واپس گئے تو پٹو نے کمرے میں

جھانکا۔ مسٹر میسن آرام کرسی پر آنکھیں بند کئے اور پیر پھیلائے لیٹے تھے۔ گو اپنے فوجی مارچ کے دوران وہ ستاتے بھی رہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ بہت تھک گئے ہیں۔ پٹو کمرے میں ایک طرف بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر میں مسٹر میسن جاگے تو وہ اپنے اصلی روپ میں آچکے تھے۔ انہوں نے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا اور چونک کر پوچھنے لگے "ارے ڈاکٹر کوہی اور ان کے مہمان نہیں آئے؟ بڑی دیر ہو گئی"۔

پٹو نے جواب دیا "آئے بھی اور چلے بھی گئے"۔

"ہائیں! کیوں؟" مسٹر میسن نے حیران ہو کر کہا۔ پٹو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ اس نے کچھ سوچا اور پھر جھجکتے ہوئے بولا:

"دراصل اس وقت آپ...... میرا مطلب ہے آپ...... ذرا" مسٹر میسن زور سے ہنسے اور بولے "اچھا اچھا میں سمجھ گیا...... ہاں ہاں ہاں...... ذرا ذرا سا یاد پڑتا ہے...... اچھا ٹھیک ہے۔ میں انہیں فون کروں گا۔ برا ہوا کہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مہمان کیا کہے گا۔ ارے ہاں یہ بتاؤ کہ وہ مہمان کون تھے؟"

"ڈاکٹر کوہی نے یہ تو نہیں بتایا۔ میرا اندازہ ہے کہ کوئی غیر ملکی تھے۔ جوان آدمی تھے۔ اچھا لباس تھا۔ پڑھے لکھے لگتے تھے"۔

پٹو نے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد مسٹر میسن نے ڈاکٹر کوہی کا نمبر فون پر ملایا۔ اتفاق سے وہ فوراً ہی مل گئے۔ مسٹر میسن نے ملاقات نہ ہونے پر بڑا افسوس ظاہر کیا۔ ڈاکٹر کوہی بولے:

"کوئی بات نہیں مسٹر میسن...... میں پھر آجاؤں گا"۔

مسٹر میسن نے کہا "آپ تو آجائیں گے لیکن وہ آپ کے مہمان؟ وہ بھلا کیا کہہ رہے ہوں گے کہ عجیب آدمی ہے۔ پہلے بلایا اور پھر"۔

ڈاکٹر کوہی نے قہقہہ لگا کر کہا "پہلے بلایا اور پھر روپ بدل لیا۔ یہی نا؟ ہاہاہا...... ارے مسٹر میسن فکر نہ کریں جب آؤں گا تو انہیں بھی ساتھ لاؤں گا۔ انہیں آپ کے مرض کے بارے میں سمجھا دیا ہے"۔

مسٹر میسن نے بے صبری سے کہا "تو کچھ امید دلائی ہے انہوں نے؟"

ڈاکٹر کوہی نے جواب دیا "مسٹر میسن امید پر تو دنیا قائم ہے" مسٹر میسن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا:

"آپ کتنے ہمدرد ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہمیشہ میری بھلائی کی فکر رہتی ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ کیا یہ صاحب ایم۔ پی۔ ڈی کے ماہر ہیں؟ کہیں باہر سے آئے ہیں یا یہیں رہتے ہیں؟ اور ان کا تجربہ کیا کہتا ہے کہ...... میرا مطلب ہے کہ صحت کا کیا امکان ہے؟"

(باقی آئندہ)

سنہری باتیں

(مرسلہ: علی طاہر۔ مراد پور)

☆ باوفا دوست قیمتی ہیرے سے کم نہیں۔ (چینی کہاوت)

☆ منزل کی دوری سے گھبرانے سے بہتر ہے کہ کچھوے کی طرح رینگتے رہو۔ (چینی کہاوت)

☆ گناہ اگرچہ زہر نہیں لیکن زہر سے زیادہ مہلک ہے۔ (اورنگ زیب عالمگیر)

☆ اگر چڑیاں متحد ہو جائیں تو شیر کی کھال کھینچ سکتی ہیں۔ (چینی کہاوت)

☆ دوست کو اپنے حال سے اتنا باخبر رکھو کہ اگر دشمن بھی ہو جائے تو نقصان نہ پہنچ سکے۔ (دانش عرب)

☆ سوچ بچار اور غور و خوض کرنا انسان کو کندن بنا دیتا ہے۔ (چینی کہاوت)

ایک حیران کن سچائی

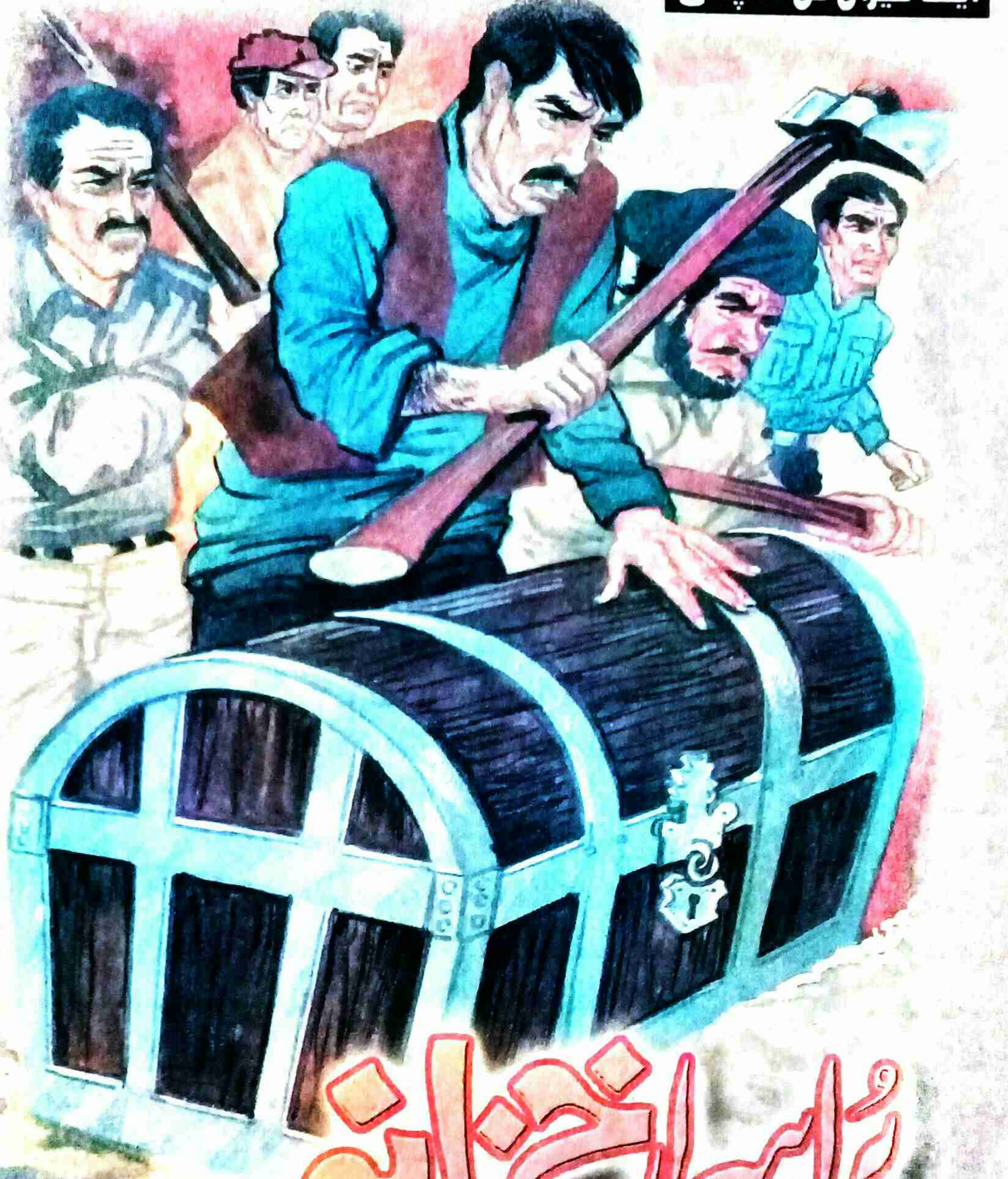

پُراسرار خزانہ

جنید احمد

جون کا سورج جزیرے پر آگ برسا رہا تھا۔ اوک آئی لینڈ نامی یہ غیر آباد جزیرہ (یہ جزیرہ کینیڈا کے مشرقی ساحل پر واقع ہے) کدالوں اور پھاوڑوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ ساحل سے کوئی پانچ سو فٹ اندر ایک بہت بڑا شاہ بلوط کا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے تقریباً پچاس گرانڈیل، خوفناک شکلوں والے بحری ڈاکو بڑی تندہی سے ایک گڑھے میں مٹی ڈال رہے تھے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے مگر وہ غضب کی گرمی اور حبس سے بے نیاز کام میں جتے ہوئے تھے۔

ان سے کچھ فاصلے پر ایک لمبا چوڑا خوفناک صورت والا شخص انہیں بہت توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ گڑھا اب مکمل طور پر بھرا جا چکا تھا۔ "شاباش میرے ساتھیو ہمارا کام مکمل ہو چکا ہے"۔ اس خوفناک شکل والے سردار کی آواز گونجی۔ "تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ ہمارے دشمن، انگریز، ہسپانوی اور دوسرے لوگ ہمارے اس خزانے کو کبھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی اس سونے اور جواہرات تک نہیں پہنچ سکتیں۔ ہماری زندگی سخت خطرے میں ہے۔ میں بحیثیت سردار تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم سب یہاں سے جانے کے بعد شہروں میں پھیل جاؤ اور شریفانہ زندگی بسر کرنا شروع کر دو یہاں تک کہ لوگ ہمیں بھول جائیں۔ مجھے امید ہے کہ ٹھیک دس سال بعد ہمیں بھلا دیا جائے گا۔ میرا یہ آخری حکم ہے کہ اس وقت تم میں سے جو بھی زندہ ہو وہ یہاں آئے۔ اگر میں نہ بھی آیا تو تم یہ سمجھ لینا کہ میں اس دنیا میں نہیں ہوں اور تم اس خزانے کو نکال لینا کیسے؟ یہ تمہارا کام ہے، مجھے قوی امید ہے کہ آج سے ٹھیک دس سال بعد میں یہاں ہوں گا اور ہم اسے نکال لیں گے"۔

"سردار زندہ باد" ایک موٹا قزاق چلایا۔ "ہم ضرور یہاں آئیں گے"۔ ایک اور بولا۔ "تو ٹھیک ہے آج کے دن پورے دس سال بعد"۔ سردار نے کہا۔ سمندر میں نہا کر تازہ دم ہونے کے بعد انہوں نے کھانا کھایا اور ایک چھوٹے سے بحری جہاز میں بیٹھ کر شام سے پہلے وہاں سے روانہ ہو گئے، کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔

یہ بدنام زمانہ بحری ڈاکو کیپٹن جان کڈ اور اس کے ساتھی تھے۔ اس زمانے میں یعنی اٹھارویں صدی عیسوی میں اس ٹولے نے ساحلی شہروں اور جہازوں کو لوٹ کر بے پناہ دولت حاصل کی تھی۔ یہ ڈاکو بڑے بے رحم اور دلیر تھے اور انہوں نے اس وقت کی بحری طاقتوں یعنی برطانیہ، سپین اور فرانس کو ناکوں چنے چبوا دیئے تھے مگر اب صورتحال بدل چکی تھی۔ ان طاقتوں نے آپس میں اتحاد کر کے پچھلے ایک سال سے اس خونی ٹولے کے خلاف زبردست کارروائی شروع کر رکھی تھی، جس کے نتیجے میں اب ان کا ناطقہ بند ہو چکا تھا اور ان کی تعداد گھٹ کر پچاس تک رہ گئی تھی۔ ان سب کے سروں کا سرکاری طور پر انعام مقرر کیا گیا تھا۔ اپنا خزانہ چھپانے کے لیے اب ان لوگوں نے اوک آئی لینڈ کا انتخاب کیا تھا۔ کیونکہ ایک تو یہ چھوٹا سا جزیرہ بالکل ویران تھا اور دوسرا یہ کہ عام سمندری گزر گاہ سے بالکل الگ تھا۔ آج تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ یہ بحری ڈاکو کہاں غائب ہو گئے۔ غالباً ان کا جہاز ڈوب گیا تھا۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد ایک شخص نے دعویٰ کیا کہ اس نے کیپٹن کڈ کو دیکھا ہے۔ اعلیٰ حکام نے اس کی نشاندہی پر اس شخص کو گرفتار کر لیا۔ اسے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ شخص کڈ نہیں تھا۔ اس ٹولے کے خزانے کے بارے میں لوگوں کو علم تھا کہ یقیناً اسی نے اسے کہیں دفن کر دیا ہے۔ لہٰذا کافی عرصے تک بہت سے مہم جو اس خزانے کے چکر میں مختلف جگہوں پر کھدائی کرتے رہے مگر خزانہ تھا کہ اس ٹولے کی طرح نشان چھوڑے بغیر غائب ہو چکا تھا۔

پچاس سال بعد اکتوبر 1975ء کا ذکر ہے کہ تین مہم جو دوست مچھلیاں پکڑتے پکڑتے، ہنستے کھیلتے اس جزیرے پر آنکلے۔ اس روز موسم بے حد خوشگوار تھا۔ انہوں نے سارا دن یہاں گزارنے کا پروگرام بنایا اور خیمہ نصب کر دیا۔ تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد یہ لوگ جزیرے کی سیاحت پر نکلے۔ سارا جزیرہ اونچے اونچے شاہ بلوط کے درختوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے یہ اوک آئی لینڈ کہلاتا ہے۔ پھرتے، سیر کرتے انہیں ایک بہت ہی دیو قامت شاہ بلوط کا درخت نظر آیا۔ یہ تینوں اس درخت کے پاس گئے۔ انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس درخت کے نیچے زمین باقی جزیرے کی زمین سے مختلف ہے اور سرمئی رنگ کی ہے۔ ان میں سے ایک نے جو درخت کے تنے کے پاس کھڑا تھا، تنے پر ایک تیر کا نشان دیکھا۔ اس کے نیچے ایک اور مدھم سا تیر کھدا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ کسی بات کی نشاندہی کی گئی ہو۔ جیک نامی نوجوان اچانک خوشی سے ناچنے لگا اور زور زور سے چلانے لگا: مل گیا، مل گیا۔

"لگتا ہے تم پاگل ہو گئے ہو۔ کیا ملا ہے تمہیں؟" انتھونی نے جیک سے پوچھا۔ "میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ اس درخت کے نیچے کیپٹن کڈ کا خزانہ دفن ہے"۔ جیک نے چیخ کر کہا۔ انتھونی اور

ڈینیل بھی اس خزانے کے بارے میں سن چکے تھے۔ پراسرار درخت اور اس پر بنے تیر کے نشانات اور ویران جزیرہ اس بات کا ثبوت تھے کہ یہاں کچھ ہے۔ یہ تینوں واپس جانا بھول گئے۔ فوراً واپس اپنی کشتی پر پہنچے۔ خوش قسمتی سے ان کی کشتی میں دو کدالیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ پاگلوں کی طرح کھدائی کرنے لگے۔ سرمئی مٹی کی تہہ کے بعد نیلی چکنی مٹی کی تہہ نمودار ہوئی۔ دس فٹ کی گہرائی میں انہیں لکڑی کی ایک مضبوط تہہ ملی۔ اسے دیکھ کر تینوں خوشی سے ناچنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ لکڑی کی اس تہہ کو ہٹانے کے بعد خزانہ ان کے قدموں میں ہوگا۔ تینوں نے اس تہہ کو آناً فاناً توڑ دیا۔ خزانے کی بجائے ان کے سامنے ایک کمرہ آگیا۔ یہ تینوں اس میں کود گئے اور اس کے فرش کو کھودنے لگے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ انہوں نے باقی کام اگلے دن پر چھوڑا اور واپس کیمپ میں آگئے۔

اگلے روز صبح سویرے ہی یہ تینوں اس گڑھے پر آپہنچے اور کھدائی شروع کی۔ بیس فٹ کے بعد انہیں پھر لکڑی کی تہہ دکھائی دی اسے توڑنے پر پھر ایک مستطیل کمرہ۔ جیک نے کدال ایک طرف پھینکی اور کہنے لگا۔ ”ساتھیو وہ ڈاکو اتنے بیوقوف اور سادے نہیں تھے کہ خزانے کو ایک عام سا گڑھا کھود کر دفن کر دیتے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں واپس شہر جا کر جدید ساز و سامان لانا پڑے گا۔ دونوں نے اس کی تائید کی اور یہ تینوں اس گڑھے کو ایسے ہی چھوڑ کر واپس ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے دوستوں سے قرضے لیے اور چرخیاں ڈولی' مزدور اور دوسرا سامان لے کر 1803ء میں دوبارہ وہاں پہنچے۔

اب ایک نئے عزم و ہمت سے کھدائی شروع کی گئی۔ ان کے راستے میں سخت چٹانیں آئیں اور بڑے بڑے پتھریلے پشتے تاہم یہ آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ گڑھا 80 فٹ تک پہنچ گیا۔ جب 100 فٹ تک پہنچے تو اچانک گڑھے میں پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے پانی اوپر چڑھ گیا۔ یہ بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوئے۔ ایک ساتھی کی تجویز پر اس گڑھے کے ساتھ ایک اور گڑھا کھودا گیا تاکہ پانی اس گڑھے میں چلا جائے مگر جیسے ہی یہ گڑھا سو فٹ تک پہنچا تو پانی اتنی تیزی سے اس گڑھے میں آیا کہ تین مزدور ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ان تینوں کا اب دیوالیہ نکل چکا تھا۔ انہوں نے اس مہم کو خیر باد کہا اور واپس ہو گئے۔

اس گڑھے کی شہرت اب پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ بہت سے محقق میدان میں اترے۔ ان دنوں ایک ہیڈن نامی شخص نے کتاب لکھی جس میں اس نے ثابت کیا کہ یہ خزانہ کڈ کا نہیں بلکہ یہ فرانس کے نوابوں کی دولت ہے جو انہوں نے انقلاب کے بعد یہاں ماہر انجینئروں کی مدد سے دفن کی تھی۔ بہرحال مہم جو اس خزانے کے چکر میں یہاں آتے رہے۔ مگر کوئی بھی ٹیم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ ایک شخص جان لنڈز نے خاصا سرمایہ لگا کر بھاپ سے چلنے والی ایک جدید ڈرل مشین خریدی اور جزیرے پر پہنچا۔ ڈرل سے کھدائی کو 108 فٹ تک پہنچا دیا گیا۔ اب ڈرل کے راستے میں سیمنٹ کی ایک مضبوط تہہ تھی۔ اس تہہ کو ڈرل نے توڑا تو ایک کمرہ اور دکھائی دیا جس کے فرش پر سونے کی ایک زنجیر تھی۔ یہ خالص سونا تھا۔ اس بات نے لنڈز کا حوصلہ بڑھا دیا۔ اس نے مزید کھدائی شروع کی تو ایک دم پھر پانی اس گڑھے میں بھرنا شروع ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ کنواں پانی سے بھر گیا۔ اس گڑھے کے اردگرد نیچے تک زمین دوز نالیوں کا جال ہے اور جونہی کھدائی کرنے والے ایک مقررہ گہرائی تک پہنچتے ہیں ان نالیوں سے پانی بڑی تیزی سے گڑھے میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک مہم کے دوران ان نالیوں کو بند کر کے کھدائی شروع کی گئی تو جونہی برما 150 فٹ تک پہنچا تو پھر پانی اس تیزی سے اندر آیا کہ ساری مہم خاک میں مل گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب نئے نئے آلات بن گئے اور ڈرلنگ کی جدید تکنیک میدان میں آگئی تو اس گڑھے کا پہلی بار سائنسی آلات کے ذریعے تفصیلی معائنہ کیا گیا۔ ماہرین نے جو رپورٹ مرتب کی اس کے مطابق اس گڑھے یا کنویں میں ہزاروں ٹن خالص سونا موجود ہے مگر یہ کبھی بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہ کام جنہوں نے بھی کیا ہے چاہے وہ کیپٹن کڈ کے ساتھی ہوں یا فرانس سے تعلق رکھنے والے ماہرین' ان کا جادو اب تک نہیں توڑا جا سکا اور شاید کبھی بھی نہ توڑا جا سکے۔ کیپٹن کڈ نے (اگر واقعی یہ خزانہ اس کا تھا) ٹھیک ہی کہا تھا کہ آنے والی نسلیں بھی اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتیں۔

☆☆☆

گنجو میاں بنے بھالو!
کارٹون کہانی
شاہد ریاض شاہد
نرالے میاں کوئی نہ کوئی انوکھی حرکت کرتے رہتے ہیں ایک روز محلے داروں کو اکٹھا کیا اور کہنے لگے:
بھائیو! آج شام میں آپ کو بھالو پکڑ کر دکھاؤں گا!
اس کے بعد نرالے میاں نے گنجو کو بھالو کی کھال پکڑائی اور بولے:
دیکھو! آج شام تم اسے اوڑھ کر جنگل میں کھڑے ہو جانا۔ میں آ کر تمہیں پکڑ لوں گا۔
شام کو نرالے میاں محلے داروں کے ساتھ جنگل میں پہنچ گئے۔
ہاہا...... پکڑ لیا بھالو!
ادھر نرالے میاں نے بھالو کو پکڑا اور ادھر دوسری طرف سے گنجو کی آواز آئی:
بھائی یہ اصلی بھالو ہے۔ میں تو یہاں ہوں!
پھر تو جناب! نرالے میاں تھے آگے آگے اور بھالو تھا ان کے پیچھے پیچھے!
بچاؤ! بچاؤ!

حیران کُن

سید شوکت اعجاز

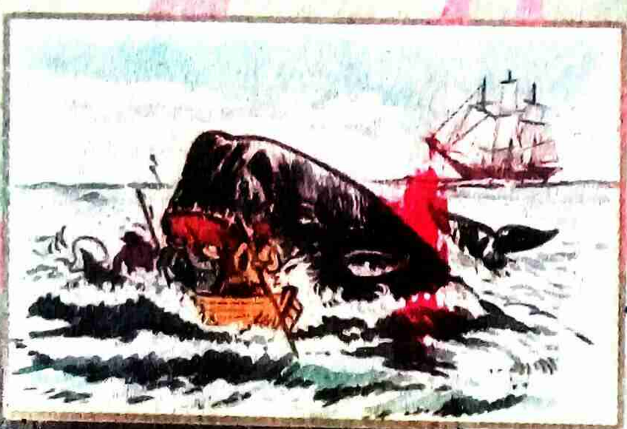

ہائے ری قسمت!

جنوبی امریکا کے ایک ماہی گیر جوناتھن سالمن اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک مخصوص ہتھیار ہارپون سے وہیل پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہیل نے اُسے منہ میں دبوچ لیا۔ لیکن ہارپون کا لوہے کا ڈنڈا اس کے منہ میں پھنس گیا جس کی وجہ سے وہ اُسے نگل نہ سکی اور وہ صحیح سلامت باہر آگیا۔ تاہم کچھ ہی گھنٹوں بعد ایک اور کوشش میں سالمن نہ بچ سکا اور وہیل اُسے نگل گئی!

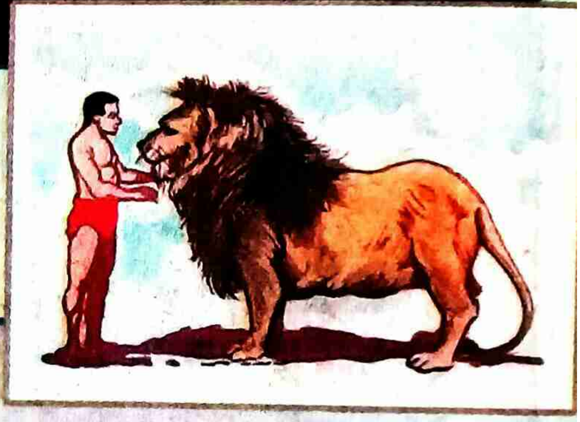

"شیروں کا دیو"

11 سالہ سمبا ببر شیر' جو انگلینڈ کے چڑیا گھر میں تھا شیروں اور چیتوں کی نسل میں سب سے بھاری بھر کم سمجھا جاتا تھا۔ اس کا وزن 826 پونڈ تھا جو ایک ریکارڈ ہے۔

اللہ تیری شان!

برصغیر میں خیاط پرندہ (TAILOR BIRD) اپنا گھونسلا ایک بڑے پتے کو خود اپنی چونچ سے سلائی کر کے بناتا ہے۔

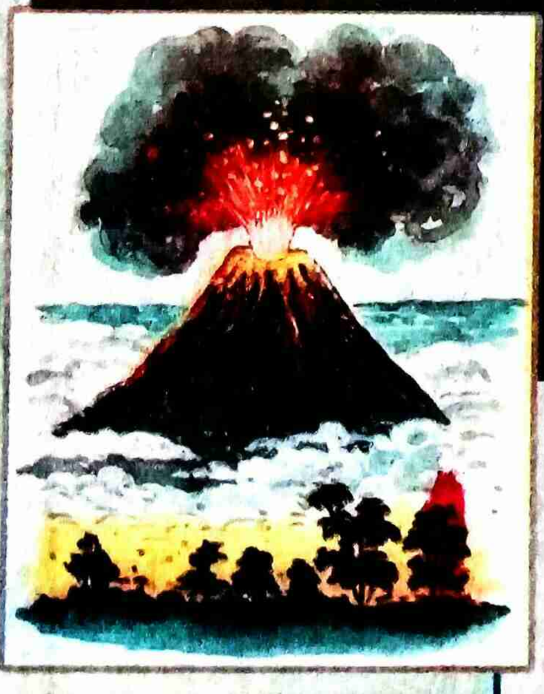

قیامت گزر گئی!

تاریخ میں سب سے بڑا قیامت خیز دھماکہ انڈونیشیا کے جزیرے "کراکاٹوا" کے آتش فشاں پہاڑ پر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں 163 گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ 36380 انسان لقمہ اجل بنے۔ بڑی بڑی چٹانیں 34 میل دور تک دور جا گریں اور گرد و غبار 3313 میل تک پھیل گیا۔ اندازہ ہے کہ یہ دھماکہ 26 ہائیڈروجن بموں کے ایک ساتھ پھٹنے کے برابر تھا۔

شرارتی لکیریں

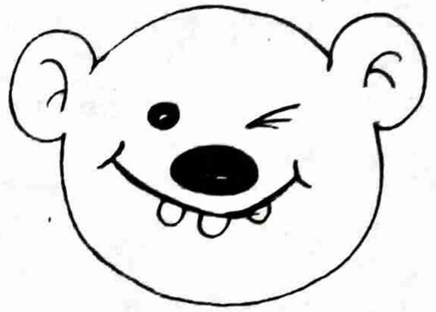

شاہد ریاض شاہد

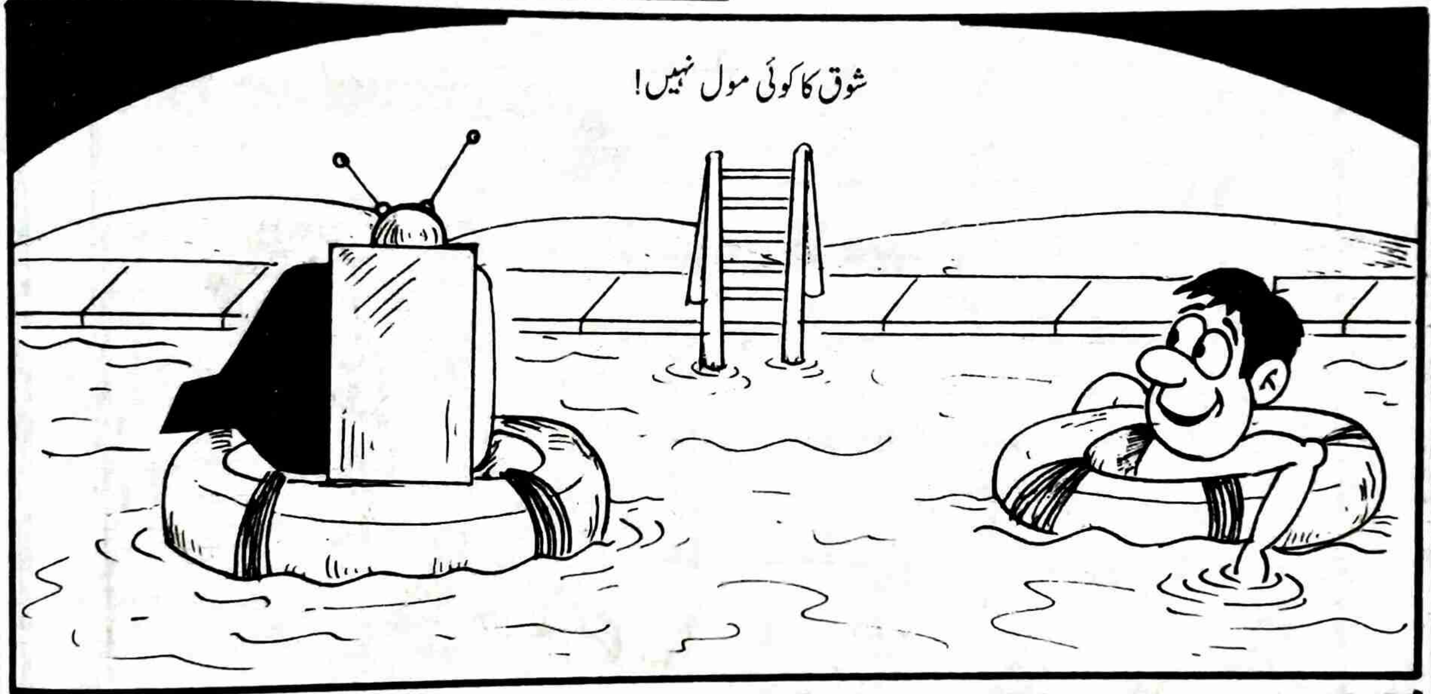

مجرم کون؟

مجرم کا کھوج لگائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر حل کے ساتھ کوپن بھیجنا ضروری ہے۔ جواب بھیجنے کی آخری تاریخ 10 نومبر 2003ء

مجرم کون ؟

نام: ____________

پورا پتا: ____________

ایک مجرم نے ٹرین میں ڈاکہ ڈالا اور زہریلی گیس چھوڑ دی۔ انسپکٹر زاہد نے موبائل پر پولیس کو اطلاع کر دی تاہم وہ نیم بیہوشی کے عالم میں گاڑی کے فرش پر گرے ہوئے تھے۔ اچانک انہیں کچھ خیال آیا اور کسی طرح گاڑی کی زنجیر کھینچ دی۔ یوں گاڑی رک گئی اور پولیس نے مجرم کو قابو کر لیا۔ آپ ذرا سوچ کر بتایئے کہ انسپکٹر زاہد نے کس طرح زنجیر کھینچی؟

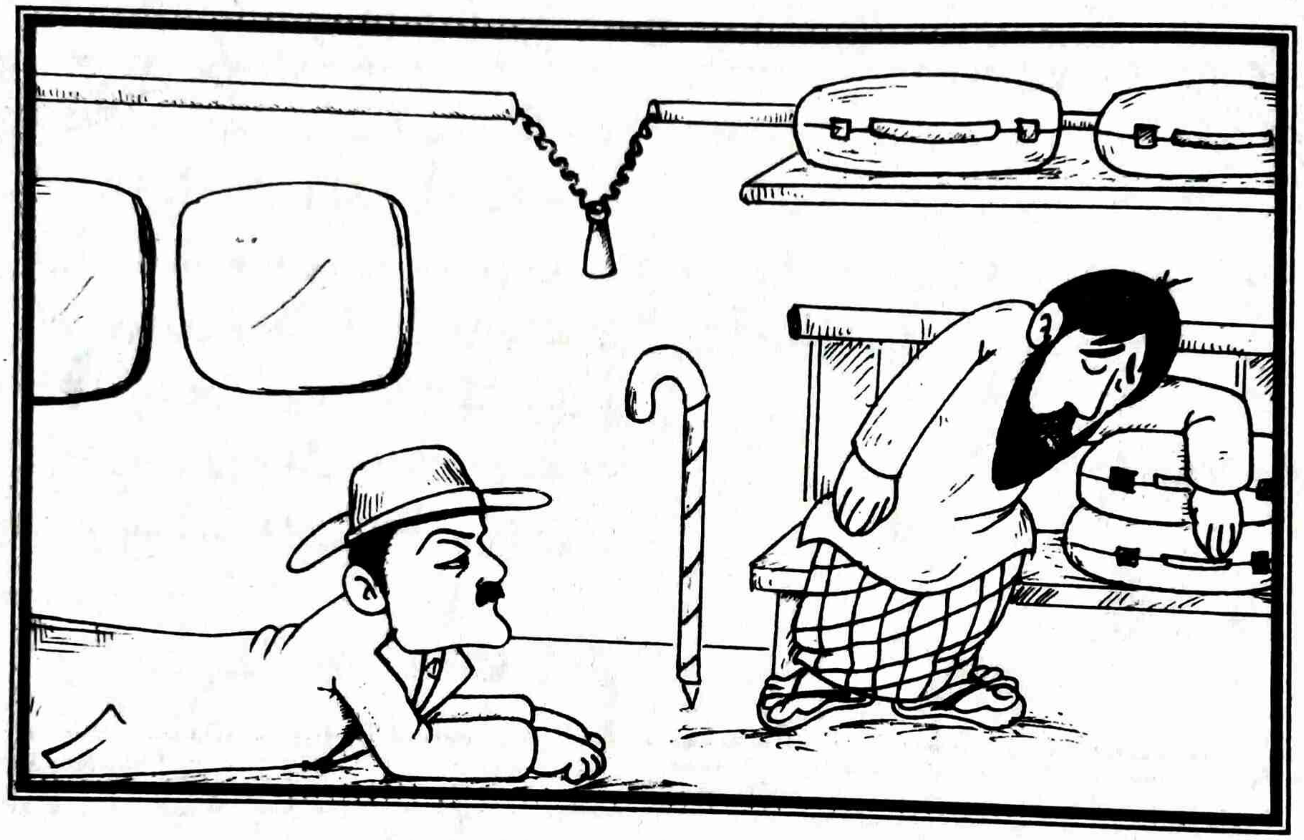

اکتوبر 2003ء میں شائع ہونے والے "مجرم کون؟" کا صحیح حل: ہیرا درخت کی شاخ پر بنے گھونسلے میں چھپا دیا گیا تھا۔ چور نے تلاشی دی اور اپنے آپ کو بڑی آسانی سے بے قصور ثابت کیا۔ تاہم انسپکٹر زاہد نے حاضر دماغی کا ثبوت دیا اور ماحول کا جائزہ لے کر ہیرا برآمد کر کے چور پکڑ لیا۔

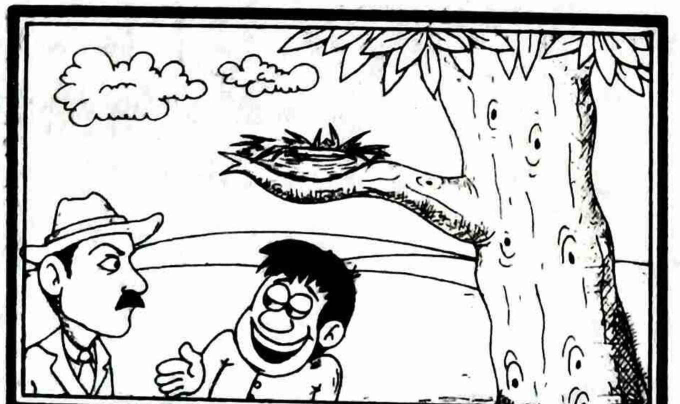

یہ جواب اس دفعہ ہزاروں بچوں نے ارسال کیا' جن میں سے 10 بچے بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار ٹھہرے۔ ان ساتھیوں کو 50' 50 روپے کی کتابیں دی جا رہی ہیں۔

(1) محمد وسیم' نوشہرہ (2) سدرہ ارشد' دینہ (3) جویریہ ہارون' لاہور (4) احمد بن طارق' سیالکوٹ (5) زنیرہ طاہر' فیصل آباد (6) نعمان عیسیٰ' راولپنڈی (7) سارہ الیاس' لاہور (8) قرۃ العین علی' ایبٹ آباد (9) کشمالہ حسین' جوہر آباد (10) محمد رضوان اسلم' گوجرہ۔

گولف

سید شوکت اعجاز

"گولف" سرسبز باغوں اور شاداب میدانوں کا کھیل ہے جس میں اونچے اونچے درخت، بڑی بڑی گھاس کے تختے، ریتلی زمین اور پانی کی رکاوٹیں مل کر اس کی دلچسپی اور کارکردگی کا حصہ بنتی ہیں۔ یہ کھیل قدیم زمانے سے مقبول چلا آرہا ہے۔ اپنے عہد کے بادشاہ اس کھیل کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے اس کھیل کو "بادشاہوں کا کھیل" کہا جاتا ہے۔ آج کے دور میں یہ کھیل اپنے مخصوص میدانوں، دیکھ بھال اور اہتمام کی وجہ سے امراء و روٴسا تک محدود سمجھا جاتا ہے تاہم اس کی مقبولیت پوری دنیا میں روز افزوں ہے۔

تاریخ کے حوالے سے قدیم رومنز "PAGNICA" کھیل کھیلا کرتے تھے جو تقریباً گولف ہی کی طرز کا تھا۔ وہ لوگ اسی طرح درخت کی بڑی سی شاخ جو آگے سے مڑی ہوتی تھی اور ایک پرندوں کے پروں سے بھری ہوئی کپڑے کی گیند سے یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ بعد میں فرانسیسیوں اور ولندیزیوں (DUTCH) نے بھی کچھ اسی طرح کا ایک کھیل ایجاد کیا جس میں وہ گیند کو ایک ڈنڈے سے مارتے تھے جس کا ہدف ایک مخصوص (UPRIGHT MARKER) عمودی نشان ہوتا تھا۔

دراصل "گولف" ایک ولندیزی لفظ "KOLF" سے لیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کلب۔ یہ کھیل چودھویں صدی میں سکاٹ لینڈ میں متعارف ہوا۔ سکاٹ لینڈ میں فالفشائر کے مقام پر ایک وسیع و عریض سرسبز میدان پر مشتمل ایک چراگاہ تھی۔ ایک روز ایک چرواہا وہاں بے خیالی میں اپنی چھڑی سے پتھروں کو ضربیں لگاتا جا رہا تھا کہ ایک پتھر چوہے یا خرگوش کے بل میں جا گرا۔ یہ عمل اُسے بہت پسند آیا اور اس نے بار بار اسے دہرایا۔ دیکھا دیکھی اس کے دوسرے ساتھی بھی اس عمل میں شامل ہوگئے۔ اس طرح یہ کھیل ہنسی مذاق میں ایک دلچسپ مقابلے کی صورت اختیار کر گیا۔ بعد ازاں یہ چراگاہ "گولف کورس" کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہاں سکاٹ لینڈ ہی کے ایک شخص نے زمین میں سوراخ کر کے گیند لڑھکانے کی ابتدا کی جو گولف کھیل کا ایک بنیادی اور نمایاں عمل ہے۔

پندرہویں صدی میں یہ کھیل بہت مقبول ہوگیا۔ لیکن بادشاہ وقت نے یکدم اس پر پابندی لگادی۔ دراصل بات یہ ہوئی کہ 1450ء میں سکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمز دوئم نے حکم جاری کیا کہ گولف ایک فضول اور بے فائدہ کھیل ہے اور اس کی مقبولیت کی وجہ سے عوام ملکی دفاع سے غافل ہو رہے ہیں۔ چونکہ تیر اندازی قومی کھیل اور ملکی دفاع کے لیے بہت اہم ہے اس لیے گولف

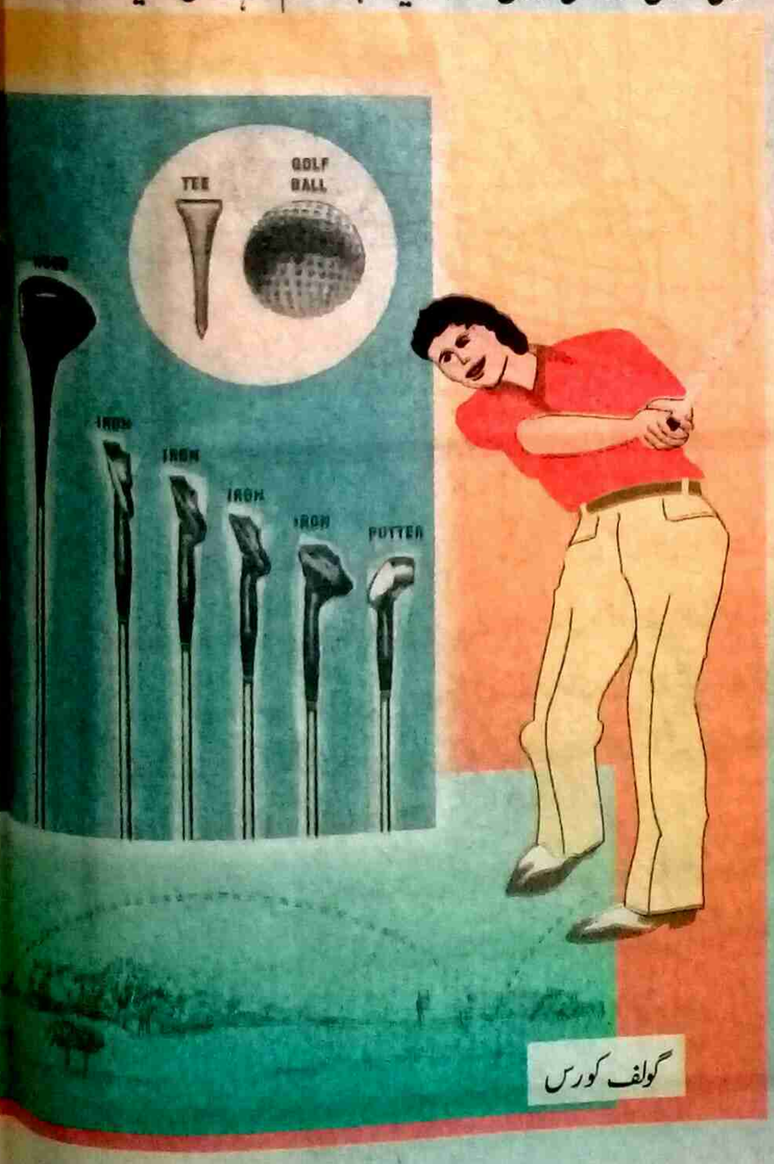

گولف کورس

کھیل پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ تقریباً پچاس سال کے بعد انگلستان کے بادشاہ چارلس اول اور سکاٹ لینڈ کے جیمز چہارم کو چونکہ اس کھیل میں خاصی دلچسپی تھی لہٰذا اس پر سے پابندی ختم کر دی گئی۔ انیسویں صدی میں یہ کھیل جزائر برطانیہ سے امریکا منتقل ہوا۔

"گولف" کا پہلا کلب اٹھارہویں صدی کے وسط میں انگلستان میں قائم کیا گیا۔ پہلا گولف ٹورنامنٹ 1860ء میں سکاٹ لینڈ میں کھیلا گیا۔ 1882ء میں گولف کے ابتدائی قوانین بنائے گئے۔ سینٹ اینڈریوز کا قدیم شاہی کلب اب بھی گولف کا ابتدائی مرکز مانا جاتا ہے اور صرف یہی کلب قواعد و ضوابط میں تبدیلی لا سکتا ہے۔

"گولف" کے میدان میں کئی قدرتی رکاوٹیں ہوتی ہیں جن میں مختلف جھاڑیاں درخت، ندی نالے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں یا ٹیلے وغیرہ۔ یہ چیزیں کھیل میں "گولفر" کے لیے زیادہ جوش و خروش اور چیلنج کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مصنوعی رکاوٹیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹے چھوٹے پانی کے تالاب یا ریتیلا گڑھا وغیرہ، جسے بنکر کہا جاتا ہے۔

گولف کا کھیل وسیع قطعہ زمین اور سرسبز کھلے میدانوں میں خاص طور پر تیار کیے گئے سطحی حصے پر کھیلا جاتا ہے جسے کورس (COURSE) کہتے ہیں۔ ایک بڑے کورس میں 18 ہولز (سوراخ) ہوتے ہیں۔ 18 ہولز والے کورس کے لیے 125 ایکڑ اراضی درکار ہوتی ہے۔ کھیل کا آغاز ایک بیضوی شکل کی ہموار سطح سے کیا جاتا ہے۔ جسے "TEEING GROUND" یا TEE کہتے ہیں۔ کھلاڑی چھڑی سے گیند کو کپ کی طرف جو ایک گول شکل میں تقریباً ساڑھے چار انچ قطر میں اور چار انچ گہرا ہوتا ہے، ضرب لگاتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کم سے کم ضربوں سے گیند سوراخ میں ڈالا جائے۔

گولف میں استعمال ہونے والی چھڑی کو کلب کہا جاتا ہے اور ایسی تمام چھڑیوں کا بیگ اٹھانے والے کو کیڈی (CADDIE) کہتے ہیں۔

گولف کی گیند سخت ربڑ سے بنی ہوتی ہے اور اس کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ جس پر 400 کے قریب بہت چھوٹے چھوٹے گڑھے سے بنے ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے گیند کو اونچی اور سیدھی اڑان میں مدد ملتی ہے۔ موجودہ دور میں گولف کے متعدد بین الاقوامی ٹورنامنٹ منعقد ہوتے ہیں جن میں برٹش اوپن۔ یو ایس اوپن۔ یو ایس پی جی (USPG) اور یو ایس ماسٹرز شامل ہیں۔

پاکستان میں گولف کا کھیل اب کافی مقبول ہوتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے عوام میں صحت مندی اور جسمانی طور پر چاق چوبند رہنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ جسمانی استعداد یعنی FITNESS کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک کورس (COURSE) میں 18 ہولز پورے کرنے کے لیے تقریباً 5 سے 6 میل تک سفر طے کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کھیل میں تفریح کے ساتھ ساتھ ورزش بھی خوب ہو جاتی ہے۔ پاکستان میں اس وقت دو درجن کے قریب گولف کورس ہیں جن میں نصف کو یقیناً بین الاقوامی معیار کے عین مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆☆☆

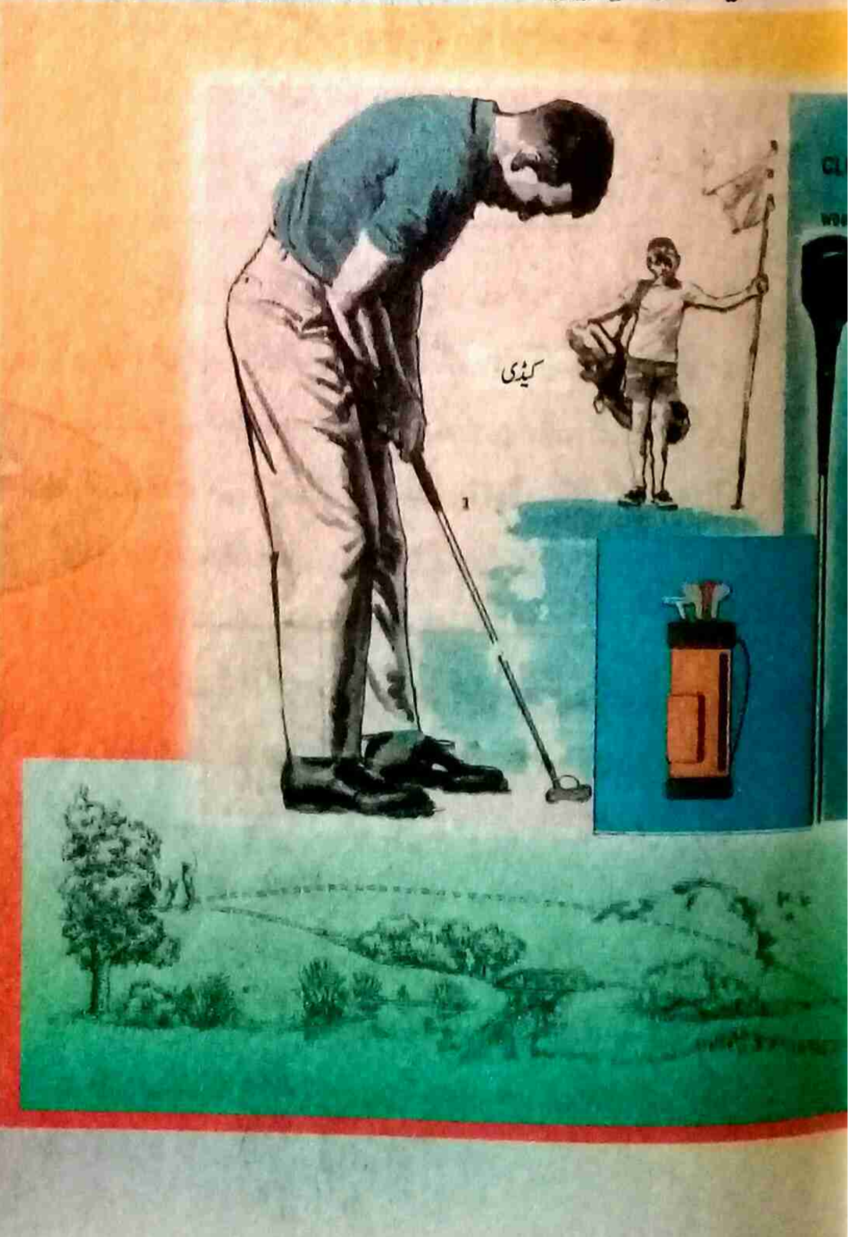

جو کرتے ہیں دنیا میں محنت زیادہ

علم کا چراغ

ڈاکٹر سید عبداللہ

چراغ سے چراغ جلے' یہ محاورہ تو آپ نے ضرور سنا ہوگا اور مشاہدہ بھی کیا ہوگا کہ ایک چراغ سے بہت سے اور چراغ جلائے جا سکتے ہیں۔ مگر آج ہم جس چراغ کا ذکر کر رہے ہیں وہ ہے علم کا چراغ...... اور وہ بھی ایسا کہ برسوں جہالت کے اندھیروں سے نبرد آزما رہا اور ہر سو علم و ادب کی روشنی پھیلاتا رہا۔ اس روشن و منور چراغ کا نام ہے ڈاکٹر سید عبداللہ' ایک شفیق استاد' بلند مرتبہ محقق' ممتاز ادیب' ماہر اقبالیات اور معروف تنقید نگار۔

ڈاکٹر سید عبداللہ 5 اپریل 1906ء کو مانسہرہ (صوبہ سرحد) کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خود بھی ایک عالم فاضل شخصیت تھے لہٰذا آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ مانسہرہ سے مڈل کا امتحان پاس کیا اور پھر مزید تعلیم کے حصول کے لیے لاہور آگئے۔ آپ نے 1926ء میں ایم اے فارسی اور 1932ء میں ایم اے عربی کی ڈگری اعزاز کے ساتھ حاصل کی۔ 1927ء سے لے کر 1931ء تک آپ نے فارسی ادبیات کے ریسرچ سکالر کے طور پر خدمات سر انجام دیں۔ اس کے بعد 1935ء میں انہیں فارسی ادبیات ہی کے حوالے سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی گئی۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ساٹھ سال تک پنجاب یونیورسٹی میں درس و تدریس اور ریسرچ کے امور انجام دیتے رہے۔ 1929ء میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں مخطوطات کی فہرست نگاری پر مامور کیا گیا۔ اِس دوران آپ نے تحریر و تحقیق کا کام برابر جاری رکھا اور اہم کتابیں تصنیف کیں۔ 1965ء میں بحیثیت پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔ اس کے بعد آپ کو اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو اسلامی انسائیکلو پیڈیا) کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ آخری دم تک آپ اس عہدے پر فائز رہ کر گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی تکمیل علم و ادب کے حوالے سے آپ کا وہ عظیم کارنامہ ہے جس پر پاکستانی قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان قابل قدر خدمات کے اعتراف میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو پروفیسر ایمر لطیس کا اعزاز دیا گیا۔

اردو زبان و ادب اور اقبالیات کے حوالے سے آپ کی گراں مایہ تصنیفات ادبی دنیا میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اردو کو سرکاری زبان کے طور پر رائج کرانے کے لیے آپ ہمیشہ ہر سطح پر کوشاں رہے۔ تحریر و تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے پر 1961ء میں حکومت ایران نے آپ کو "نشان سپاس" کا اعزاز دیا۔ 1960ء میں صدر پاکستان کی طرف سے آپ کو "تمغہ حسن کارکردگی" (پرائڈ آف پرفارمنس) ملا اور پھر 1983ء میں آپ کو "ہلال امتیاز" سے نوازا گیا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ جتنے بڑے عالم اور محقق تھے اسی قدر ایک سادہ منش انسان تھے۔ نہایت با اخلاق' کم گو' شفیق اور ملنسار شخصیت کے مالک تھے۔ عربی' فارسی' انگریزی اور اردو پر کمال دسترس رکھتے تھے۔ ان کی بے شمار تحقیقی کتابیں اور سینکڑوں مضامین ان کی علمی لگن اور تحقیق و جستجو کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ علم و ادب کے میدان میں کئی نسلوں نے ان سے استفادہ کیا اور زندگی کے میدان میں کمال رہنمائی حاصل کی۔ اردو اور فارسی زبان و ادب پر آپ کے بہت سے احسانات ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ: "محبت' شفقت' خدمت میرا اصولِ زندگی ہے اور صبر' شکر' قناعت میرا مسلک اور شیوہ ہے"۔ آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ بلاشبہ انہی روشن اُصولوں کا آئینہ دار تھا۔ ایک بھرپور' کامیاب اور قابل فخر زندگی گزار کر بالآخر علم و ادب کا یہ چراغ وطن عزیز کے کونے کونے میں علم کی روشنی پھیلا کر 14 اگست 1986ء کو ہمیشہ کے لیے بجھ تو گیا مگر اس سے روشن ہونے والے دوسرے ہزاروں لاکھوں چراغ آج بھی جہالت کے اندھیرے دور کرتے ہوئے نسلِ نو کی تعلیم و تربیت اور کردار سازی کا عظیم فریضہ سر انجام دے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے' ان شاءاللہ! (سید محمد جاوید امتیازی)

تحریر و ترتیب، تحقیق: ڈاکٹر محمد اقبال ثاقب

سرزمینِ ایران پر جنگ کا طوفان

قسط نمبر 11

جب منوچہر اس جہان سے رخصت ہوا تو اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہو گیا۔ لیکن نوذر باپ کی طرح لائق اور دور اندیش بادشاہ ثابت نہ ہوا۔ وہ اچھائی کا سیدھا راستہ چھوڑ کر زر و مال کی دلدل میں اتر گیا۔ اس کا ظلم اور لالچ انتہا کو پہنچ گیا۔ اب ایران کے لوگ اپنے بادشاہ کے خلاف سر عام باتیں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں نے مناسب طریقے سے بادشاہ کو اس کے غلط رویے کی نشاندہی بھی کی۔ مگر جب انسان کے سر پر ہوس اور لالچ کا بھوت سوار ہو تو اس کی عقل ماری جاتی ہے۔

لوگوں کے شدید واویلا کرنے کے باوجود نوذر کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے اپنے ظلم کا بازار اسی طرح گرم رکھا۔ جب ایران کے لوگ بہت تنگ آگئے تو وہ نوذر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ نوذر کو اس مخالفت کا علم ہوا تو وہ یک دم گھبرا گیا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ سام کو پیغام بھیجا کہ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے گرگساران سے ایران کی طرف آئے۔ جب بوڑھے

پہلوان نے نوذر کا پیغام سنا تو اس نے ان حالات پر افسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ نوذر کے ظلم وستم سے تنگ لوگوں کے خلاف وہ لڑے۔ وہ جانتا تھا کہ مظلوم عوام حق پر ہیں۔ لیکن پھر بھی سام نوذر کے محل کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ اسے کچھ سمجھائے اور راہ راست پر لائے۔ جب وہ نوذر کے محل کے نزدیک پہنچا تو باغی عوام نے سام کا راستہ روک لیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ اب سام بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ انہوں نے اس کا بہت احترام کیا اور اسے نوذر کے ظلم وستم کی بہت سی کہانیاں سنائیں۔ سب نے ایک آواز ہو کر کہا کہ ہم ایسے ظالم اور بدکردار شخص کو اپنا بادشاہ نہیں رہنے دیں گے۔ لوگوں نے سام کو تجویز پیش کی کہ آپ بادشاہت کا تاج سر پر رکھ لیں اور نوذر کی جگہ بادشاہ بن جائیں۔

سام نے جب یہ باتیں سنیں تو کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اب وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اُس کے جسم میں جوانی والی طاقت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن دانائی اور برداشت کی دولت اب بھی اس کے پاس موجود تھی۔ اس نے اپنا چہرہ ناراض اور مظلوم لوگوں کی طرف موڑا اور کہنے لگا:

”اے بہادر لوگو! مجھے بادشاہت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں ایران کی سرزمین کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔ لیکن بادشاہت کے تخت پر کبھی نہیں بیٹھوں گا۔ آپ جان لیں کہ مجھے بھی نوذر کی بدکاریوں کا پورا علم ہے۔ مجھے بھی اتنا ہی دکھ ہے جتنا آپ کو ہے۔ لیکن میں مشورہ دوں گا کہ آپ نوذر کو اپنی اصلاح کا ایک موقع اور دیں اور اس سے صلح کر لیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ دوبارہ اگر اس نے اپنی یہ حرکتیں جاری رکھیں تو میں آپ کے ساتھ مل کر اس کے خلاف تلوار اٹھاؤں گا“۔

حالانکہ لوگ نوذر کی بری حرکتوں اور ظلم وستم سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے پھر بھی انہوں نے بوڑھے سام کی بات کو احتراماً قبول کر لیا۔ سام نے جب لوگوں کو اپنا ہم خیال پایا تو بڑا خوش ہوا اور بولا ”اب آپ میرے ساتھ نوذر کے دربار میں چلیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچائے گا“۔

جب سام لوگوں کے ہمراہ نوذر کے دربار میں پہنچا تو وہ پریشان اور پژمردہ صورت میں تخت پر بیٹھا تھا۔ جب نگہبان نے اسے سام کے آنے کی اطلاع دی تو وہ خوشی سے تخت سے نیچے اتر آیا اور بزرگ پہلوان کے استقبال کے لیے چل پڑا۔ نوذر جب سام کے قریب پہنچا تو حال چال پوچھنے کے بعد چاپلوسی کی غرض سے اس کی دلیری کی تعریف کرنے لگا۔ سام نے نوذر کی ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور بڑے آرام سے کہنے لگا ”اے بادشاہ! اس وقت عوام آپ سے بہت ناخوش ہیں۔ اب عوام کے چند سرکردہ نمائندے میرے ساتھ آئے ہیں تاکہ آپ سے جنگ کی بجائے صلح و دوستی کا ہاتھ بڑھائیں“۔

نوذر نے سام کی جب یہ بات سنی تو بڑا حیران ہوا۔ وہ یہ بات سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے مخالف اتنی آسانی سے صلح کے لیے آمادہ ہو سکتے ہیں۔ سام نے نوذر شاہ کو تمام حالات سے آگاہ کیا کہ اگر تم نے ظلم کا بازار اسی طرح گرم رکھا تو یہ لوگ دوبارہ تمہارے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ اپنی سابق غلطیوں کو نہیں دہراؤ گے تو یہ لوگ تم سے دوستی کرنے کو تیار ہیں۔ نوذر کے پاس سام کی اس تجویز کو ماننے کے سوا دوسرا چارہ نہیں تھا۔ سام نے اپنے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو دربار میں بلایا اور نوذر نے ان کے ساتھ وعدہ کیا کہ آئندہ ان کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ اس طرح سے صحراؤں کی سرزمین میں خانہ جنگی کے شعلے خاموش ہو گئے اور سب اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹ گئے۔

ادھر ایران کے ہمسایہ ملک توران کے بادشاہ ”پشنگ“ کو جب یہ خبر ملی کہ منوچہر شاہ کے بعد اس کا نالائق بیٹا نوذر تخت پر بیٹھا ہے اور لوگ بھی اس سے خوش نہیں ہیں تو اس نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ ایران کے بادشاہ سے پرانی دشمنی کا حساب لے۔ یاد رہے کہ پشنگ اسی تور کی اولاد تھا جو ایرانی لشکر کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

باپ کے اشتعال دلانے پر پشنگ کا ایک بیٹا ”افراسیاب“ ایران کے خلاف لشکر کشی کے لیے تیار ہو گیا۔ مگر دوسرا بیٹا ”اغریرث“ کچھ عقلمند تھا اور جنگ کے حق میں نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ پہلے سلم اور تور نے ایرانیوں پر ظلم کیا تھا جس کی سزا ان کو ملی تھی۔ اس نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ایران کا بادشاہ جیسا

بھی ہو مگر اس ملک کے سپہ سالار بہت لائق اور بہادر ہیں۔ اس لیے ہمیں ایران پر فوج کشی نہیں کرنی چاہیے۔ پشنگ کے سر پر بدلے کا بھوت سوار تھا۔ اس نے اغریرث کی ایک نہ سنی اور کہا کہ "اس مسئلے میں افراسیاب کی سوچ تم سے بہتر ہے۔ وہ بہادر اور غیرت مند ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ایرانیوں سے ضرور بدلہ لے گا"۔ اغریرث کو یقین ہو گیا کہ مزید بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کو جنگ یقینی نظر آ رہی تھی۔

آخر کار پشنگ نے افراسیاب کو ایران کے خلاف لشکر تیار کرنے کا حکم دے دیا۔ ایران میں ابھی موسم بہار کا آغاز ہوا ہی تھا کہ اس پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ اس سال بہار کے آغاز میں ہی ایک اور حادثے نے پورے ایران کو سوگوار کر دیا۔ یہ حادثہ سام پہلوان کی موت تھی۔ ایرانی قوم اپنے اس بہادر سپہ سالار کے مرنے پر بہت غمگین تھی۔ اس بہادر جرنیل نے ایرانیوں کے لیے بہت قربانیاں دی تھیں۔ زال بھی باپ کی موت پر بہت غمزدہ تھا۔ اس نے باپ کی مردہ لاش کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور آخری رسومات کی ادائیگی کے لیے گوراب کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب نوذر کو اطلاع پہنچی کہ تورانیوں کا لشکر دریائے جیحوں عبور کرنے کے بعد ایران کی طرف بڑھ رہا ہے تو بہت پریشان ہوا۔ سام مر چکا تھا اور زال بھی لشکر میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ نوذر نے باقی سرداروں کو بلایا اور جلدی سے لشکر تیار کرنے کا حکم دیا تاکہ تورانی فوج کا مقابلہ کیا جائے۔ نوذر کا لشکر بھی آمادہ ہو کر افراسیاب کے لشکر کی طرف روانہ ہو گیا تاکہ حملہ آور فوج کا راستہ روکا جا سکے۔ دونوں لشکر دھستان کے مقام پر آمنے سامنے آ گئے۔

افراسیاب کو بھی ایرانی فوج کے آنے کی خبر مل گئی۔ وہ اپنے خیمے میں فوج کے سرداروں کے ساتھ صلاح مشورے میں مشغول تھا کہ دربان نے ایک مخبر کے آنے کی اطلاع دی۔ افراسیاب نے اسے فوراً اندر بلا لیا۔ مخبر نے آنے کے بعد بتایا: "اے دلیر سرداران فوج! آپ کے لیے ایک اچھی خبر لے کر آیا ہوں کہ سام پہلوان مر گیا ہے اور اس کا بیٹا زال بھی باپ کی تدفین کے لیے گوراب کی طرف چلا گیا ہے"۔

افراسیاب نے جب یہ خبر سنی تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ اس

نے اسی خوشی کے عالم میں اپنے سرداروں کی طرف چہرہ کیا اور بولا: "اب ہمارا کام بہت آسان ہو گیا ہے۔ مجھے صرف سام اور زال کا ہی خوف تھا۔ اب ہم ایرانی لشکر کو بڑی آسانی سے شکست دے سکتے ہیں"۔

اس کے بعد افراسیاب نے اپنے دو سرداروں کو حکم دیا کہ وہ تیس ہزار سپاہی لے کر گوراب کی طرف روانہ ہو جائیں اور اس سے پہلے کہ زال ایرانیوں کے لشکر کے ساتھ مل جائے، اسے گوراب میں ہی ختم کر دیں۔ افراسیاب کا حکم سننے کے بعد دونوں سردار خیمے سے نکل گئے اور تیس ہزار سوار ساتھ لے کر زال کو مارنے کے لیے گوراب کی طرف روانہ ہو گئے جہاں وہ اپنے باپ سام کو سپرد خاک کرنے گیا ہوا تھا۔

دوسرے سرداروں کو افراسیاب نے اگلی صبح ایرانی فوج پر حملے کا حکم دیا۔ صبح ہوئی تو دونوں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ تورانیوں کے لشکر میں سب سے بڑا اور بہادر پہلوان "بارمان" افراسیاب کے پاس آیا اور بولا "اگر شہزادہ افراسیاب حکم دے تو سب

سے پہلے میں میدان میں نکلوں اور ایرانی لشکر سے اپنے برابر کے پہلوان کو للکاروں تاکہ ایک کے مقابلے میں ایک پہلوان کی لڑائی کا آغاز ہو سکے"۔

اس سے پہلے کہ افراسیاب بارمان کی بات کا کوئی جواب دیتا اغریرث بول اٹھا: "یہ عقل مندی نہیں کہ ہمارے لشکر سے بارمان جیسا اہم اور بہادر پہلوان سب سے پہلے میدان میں اترے۔ کیونکہ اگر بارمان کو کوئی نقصان پہنچا تو باقی لشکر بددل ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہو گا کہ جنگ کے لیے بارمان کے علاوہ کوئی دوسرا جنگ کا آغاز کرے"۔

افراسیاب کو بھائی کی یہ بات پسند نہ آئی۔ اس نے بارمان کو غصے سے کہا: "تم تلوار اور ڈھال لے کر میدان میں اتر جاؤ۔ ایرانی لشکر میں کوئی ایسا نہیں ہے جو تمہارا مقابلہ کر سکے"۔

افراسیاب کا یہ حکم سننے کے بعد بارمان جنگ کے لیے تیار ہو کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایرانی لشکر کے قریب پہنچ کر بارمان للکارتے ہوئے بولا "ایرانیو! کیا تم میں سے کوئی مائی کا لال مجھ سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہے؟"

ایران کے سپہ سالار "قارن" نے یہ للکار سننے کے بعد لشکر کی طرف نگاہ دوڑائی تاکہ دیکھے کہ کوئی بارمان سے جنگ کے لیے نکلتا ہے۔ کافی دیر تک کوئی بھی جنگ کے لیے نہ نکلا۔ پھر قارن کا بوڑھا بھائی "قباد" بارمان سے لڑنے کے لیے نکل آیا۔ یہ دیکھ کر قارن غمزدہ ہو کر بولا: "بھائی، تمہاری عمر جنگ لڑنے کی نہیں ہے۔ ہم تو آپ کو راہنمائی کے لیے ساتھ لائے ہیں۔ اگر تمہارے سفید بال خون سے سرخ ہو گئے تو تمام سپاہی ناامید ہو جائیں گے"۔

لیکن قباد نے قارن سے کہا: "آخرکار موت ہی سب کا مقدر ہے۔ بستر میں مرنے سے بہتر میدان جنگ میں مرنا ہے"۔ یہ کہنے کے بعد قباد تلوار اور ڈھال تھام کر گھوڑے پر سوار ہو کر بارمان کی طرف روانہ ہو گیا۔ بارمان نے جب بوڑھے پہلوان کو جنگ کے لیے آتے دیکھا تو بولا:

"اے بوڑھے! آج تک موت سے بھاگتے رہے ہو مگر آج بھاگ نہیں سکو گے"۔ یہ کہنے کے بعد بارمان قباد پر ٹوٹ پڑا دونوں کے درمیان دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ دوپہر تک دونوں پہلوان ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرکار تورانی پہلوان بارمان نے قباد کو ایسی ضرب لگائی کہ وہ گھوڑے سے گر پڑا اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

قارن نے جب بھائی کو مرتے دیکھا تو بہت غمزدہ ہو گیا۔ اس نے اپنے لشکر کی طرف منہ کر کے تورانی فوج پر حملے کا حکم دے دیا۔ اب ایرانی اور تورانی فوج کے درمیان خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں اور میدان کی خاک خون سے سرخ ہونے لگی۔

(باقی آئندہ)

آپ بھی لکھیے

رحمدل سردار

آصف علی خان' شور کوٹ

افغانستان کا ایک علاقہ غزنی کہلاتا ہے۔ سبکتگین اس علاقے کا سردار تھا۔ وہ بہت رحمدل اور خدا ترس انسان تھا۔ ایک دن وہ شکار کھیلنے گیا۔ جنگل میں تمام دن مارا مارا پھرتا رہا لیکن کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ شام ہونے کو آئی تو وہ مایوس ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر واپس آرہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ہرنی کے ایک بچے پر پڑی۔ وہ دل میں بہت خوش ہوا۔ آخر شکار مل ہی گیا خواہ چھوٹا ہی سہی۔ اس نے بچے کو قابو میں کیا اور گھوڑا واپسی کے لیے موڑا۔ کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ہرنی اس کے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔ وہ حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سبکتگین سمجھ گیا کہ ہرنی اس بچے کی ماں ہے۔

سبکتگین اس منظر کی تاب نہ لا سکا اس نے سوچا کہ کتنا سنگدل شخص ہوں کہ پیٹ کی خاطر ماماتا کا خون کر رہا ہوں۔ یہ خیال آتے ہی سبکتگین نے ہرنی کے بچے کو چھوڑ دیا۔

(پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

کردار کی عظمت

محمد راحیل باوانی' حیدر آباد

علامہ اقبالؒ نہایت بلند کردار انسان تھے۔ انہوں نے زندگی بھر اپنے اساتذہ کا احترام کیا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اعلیٰ مقام پر فائز ہوئے۔ جب حکومت ہند نے انہیں "سر" کا خطاب دینا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ: اگر مجھے سر کا خطاب دینا ہے تو سب سے پہلے اسے ملنا چاہیئے جس نے مجھے آج اس قابل بنایا ہے اور وہ ہیں میرے محترم اُستاد مولوی میر حسن۔ چنانچہ حکومت نے پہلے مولوی میر حسن کو شمس العلماء اور پھر علامہ اقبال کو سر کا خطاب دیا۔

علامہ اقبالؒ ایک سچے عاشق رسولؐ تھے۔ آنحضرت ﷺ کا نام سنتے ہی ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک غیر مسلم نے کہا کہ آپ خود اتنے بڑے فلسفی اور عالم ہیں آپ مجھے بتائیں کہ وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو پیغمبرؐ اسلام کا اس قدر شیدائی بنا دیا۔

یہ سن کر علامہ اقبال نے پرجوش لہجے میں کہا کہ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ جب نبی کریم ﷺ نے نبوت کا اعلان کیا اور لوگوں سے پوچھا کہ آیا میں نے آج تک کبھی جھوٹ بولا ہے تو تمام لوگوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ ہم نے کسی موقع پر آپ کو جھوٹ بولتے نہیں دیکھا۔ کیا یہی واقعہ نبی کریم ﷺ کی عظمت پر ایمان لانے کے لیے کافی نہیں ہے"۔ یہ کہہ کر ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

"دیانت داری"

عمران عابد' ڈنگہ

پٹنہ میں علامہ اقبالؒ کے ایک دوست بیرسٹر سی۔ آر۔ داس کے پاس کسی نواب صاحب کا مقدمہ آیا۔ اس مقدمے میں نواب صاحب کی جن دستاویزات کو عدالت میں پیش کرنا تھا وہ فارسی میں تھیں۔ عدالت میں پیش کرنے کے لیے ان کا انگریزی ترجمہ ہونا ضروری تھا۔ بیرسٹر سی۔ آر۔ داس نے فارسی سے انگریزی ترجمے کے لیے علامہ اقبالؒ کا انتخاب کیا اور ایک ہزار روپے روزانہ کے حساب سے فیس طے کی اور علامہ کو پٹنہ بلایا۔ علامہ اقبالؒ نے اسی رات تمام دستاویزات دیکھیں اور ان کا انگریزی ترجمہ مکمل کر دیا۔

سی۔ آر۔ داس نے علامہ اقبالؒ سے کہا "آپ نے یہ کیا کیا؟ اس کو تو یہ مسودہ کئی روز میں مکمل کرنا تھا کیونکہ آپ کو ایک ہزار روپے روزانہ فیس کی پیش کش کی گئی تھی"۔

علامہ اقبالؒ نے جواب دیا۔ "میرے رسول ﷺ نے مجھ پر ایسی اجرت حرام کر دی ہے جو کسی مختصر کام کو طویل کر کے لی جائے"۔

بیرسٹر سی۔ آر۔ داس علامہ اقبالؒ کے اس جواب سے بہت متاثر ہوا۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

نیکی رائیگاں نہیں جاتی

نازش جمیل گجرات

پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی ملک میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ وہ بہت ظالم تھا۔ اس کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اس کا ایک غلام اس کے محل سے بھاگ کر جنگل میں چلا گیا۔ وہ وہاں جنگلی پھلوں سے گزارہ کر لیتا تھا اور کبھی کبھی چھوٹا موٹا شکار بھی کر لیتا آیا۔ ایک دن وہ شکار کرنے کے لیے جا رہا تھا کہ اسے دور سے ایک شیر آتا دکھائی دیا۔ وہ شیر کو دیکھ کر بہت گھبرایا۔ شیر کے پنجے میں ایک بڑا کانٹا چبھا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر غلام کو اس پر رحم آگیا اور اس نے وہ کانٹا نکال دیا۔ شیر دم ہلا ہلا کر اپنے محسن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ کے سپاہی اس غلام کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچ گئے اور اس کو پکڑ کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ بادشاہ نے اس غلام کو یہ سزا سنائی کہ اسے بھوکے شیر کے آگے ڈالا جائے۔ شہر کے تمام لوگ ایک دن میدان میں جمع ہوئے اور پھر اس غلام کو بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ شیر قریب آکر اس غلام کے پاؤں چاٹنے لگا۔ بادشاہ اور اس کے وزیر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔

دراصل یہ وہی شیر تھا۔ جس کے پنجے سے اس غلام نے کانٹا نکالا تھا۔ یہ شیر نیکی کا بدلہ چکا رہا تھا۔ بادشاہ نے جب اس غلام سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے تو پھر غلام نے اس کو تمام قصہ سنایا۔ یہ سن کر بادشاہ بہت متاثر ہوا اور اس نے غلام کو آزاد کر دیا۔ واقعی نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ (چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

سزا

شاہد ضیاء، پشاور

"ارے تعلیم و تربیت کا خصوصی شمارہ آگیا۔ بھئی عمران ذرا دینا"۔

کامران کی چیختی ہوئی آواز عمران کے کانوں سے ٹکرائی۔

دوسرے ہی لمحے عمران کے ہاتھ میں تعلیم و تربیت کا صرف سرورق بچا۔ باقی پورا رسالہ کامران کے ہاتھ میں تھا۔

"بدتمیز! بے صبرے! تم نے میرے نئے رسالے کا یہ حشر کر دیا۔ جانتے ہو پورے 15 روپے کا لیا تھا۔ تمہاری طرح کنجوس نہیں ہوں کہ دوسرے کے آسرے پر تعلیم و تربیت ہی نہ خریدوں" عمران نے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ان کے استاد سلطان خاں کلاس روم میں داخل ہوئے مگر اندر کی صورت حال دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

"کیا ہوا تھا؟" انہوں نے گونج دار آواز میں مانیٹر سے پوچھا۔

حامد نے پوری تفصیل بتا دی۔

"ہونہہ! ادھر آؤ عمران اور کامران" سلطان صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کامران! تم نے بڑی ہی بداخلاقی کا مظاہرہ کیا ہے"۔

"معاف کیجئے گا سر! آیندہ خیال رکھوں گا"

"تم لوگ کس قدر بے صبرے اور کتنے غصیلے ہو۔ اب دیکھو عمران کا پیارا رسالہ سرورق سے محروم ہو گیا اور کامران کو تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ اس سے بہتر تھا کہ تم پیار سے رسالہ مانگتے یا پھر بازار سے دوسرا رسالہ خرید لاتے۔ یہ رسالہ بھی ہمیں اسی بات کا درس دیتا ہے۔ اگر اس کی باتوں پر عمل نہیں کرتے تو کیا فائدہ ایسے مطالعے کا۔ اب کامران کی سزا یہ ہے کہ وہ نیا رسالہ خرید کر عمران کو دے اور پھٹا ہوا رسالہ خود رکھ لے اور عمران کی سزا یہ ہے کہ رسالہ پڑھ کر بعد میں تمام کلاس والوں کو پڑھنے کے لیے دے"۔

سر سلطان نے تفصیل سے کہا اور عمران اور کامران نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

اظہار الحق، جہانیاں

ایک دفعہ جنگل کا بادشاہ (شیر) بیمار ہو گیا۔ سب جانور اس کی مزاج پرسی کے لیے گئے۔ لیکن لومڑی نہ گئی۔ چیتے نے لومڑی کی غیر حاضری کی شکایت کر دی اور کہا کہ جناب! وہ کس قدر مطلب پرست اور مغرور ہے کہ حضور کی عیادت کے لیے نہیں آئی۔

شیر کو اس پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے حکم دیا کہ لومڑی کو حاضر کرو! لومڑی کو اس بات کی خبر ہو گئی کہ چیتے نے اس کے خلاف زہر اگلا ہے۔ جب لومڑی آئی تو شیر نے گرجتے ہوئے اس سے پوچھا: سب جانور میری بیمار پرسی کے لیے آئے مگر تم کیوں نہیں آئی؟

لومڑی نے ہاتھ جوڑ کر کہا: بادشاہ سلامت میں آپ کی بیماری کا سن کر بہت پریشان ہوئی اور دوائی کی تلاش میں ماری ماری پھرتی رہی آخر ایک حکیم نے دوائی کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آپ چیتے کے گردے نوش فرمائیں تو فوراً تندرست ہو جائیں گے۔ شیر نے یہ سنتے ہی پنجہ مار کر چیتے کو گرا لیا اور گردے نکال کر کھا گیا۔

(چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

شاعرِ مشرق کے حوالے سے ایک خصوصی تحریر!

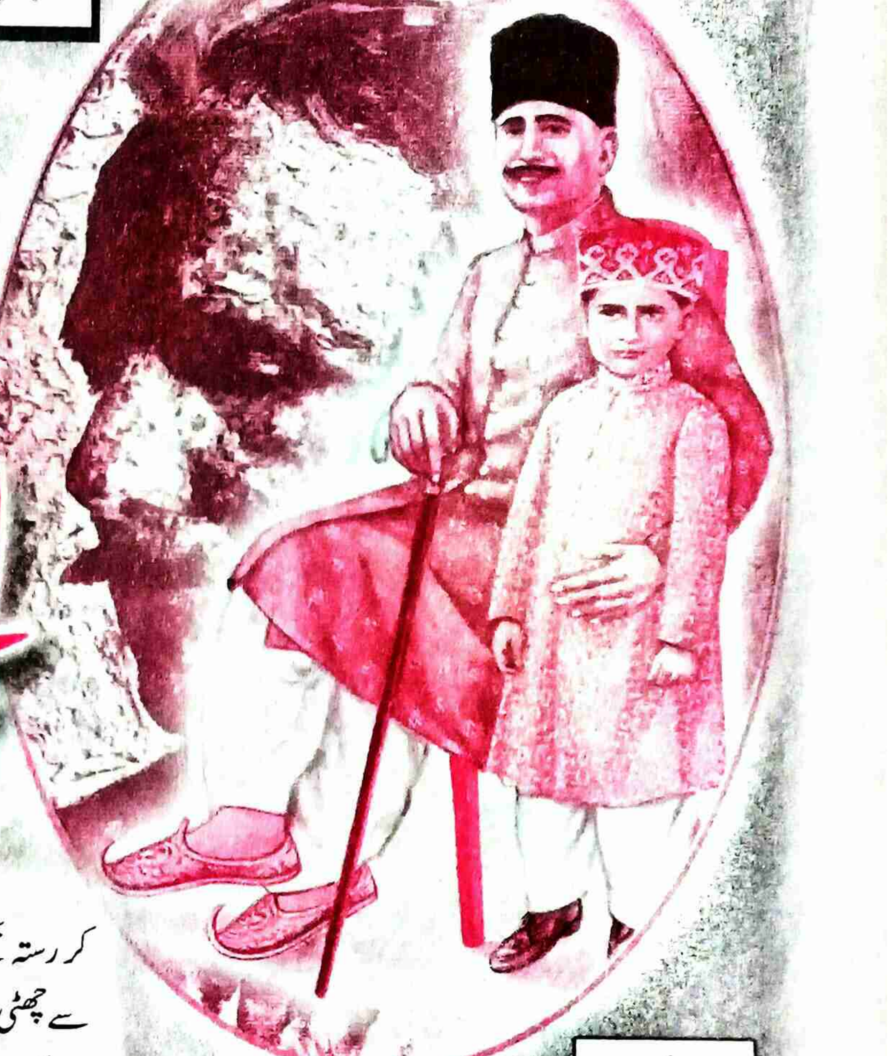

اچھے ابو!

اے ایم زاہد

"امی امی آپ کدھر ہیں"...... جاوید آنکھوں پر پٹی باندھے امی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اندھوں کی طرح ہاتھ گھماتے اور لڑکھڑاتے قدم اٹھاتے ہوئے وہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ منہ کے بل گرنے کے سبب ہونٹ پھٹ گیا۔ خون دیکھ کر وہ رونے لگا۔ امی نے فوراً آگے بڑھ کر اسے سنبھالا۔ اس کی آہ و بکا سن کر اقبال باہر نکل آئے۔ باپ ہونے کے ناتے یہ حالت دیکھ کر دل کٹ کے رہ گیا اور وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ کی آنکھ کا تارا تھا۔

جب جاوید بڑا ہوا اور سکول جانے کے قابل ہو گیا تو اسے سکول داخل کرا دیا گیا۔ آج جاوید پہلی مرتبہ ماں باپ سے جدا ہوا تھا۔ والدین کا دل اس کے بغیر گھر میں نہیں لگ رہا تھا۔ کبھی ماں جا کر رستہ تکنے لگتی تو کبھی باپ پوچھتا کہ جاوید نہیں آیا؟ بڑی مشکل سے چھٹی کا وقت ہوا اور جاوید گھر آ پہنچا۔ ماں کچن چھوڑ کے فوراً بیٹے کو چومنے لگی۔ ادھر شفیق باپ بھی اٹھ کر اس سے احوال پوچھنے لگا۔ "بیٹا کہیں اداس تو نہیں ہو گئے تھے"۔

چند سال ہی گزرے ہوں گے کہ ایک خنک شام جاوید کی امی اسے ہمیشہ کے لیے اکیلا چھوڑ گئیں۔ اس وقت تک جاوید کی ایک بہن بھی پیدا ہو چکی تھی۔ دونوں بہن بھائی روتے روتے ابو کے کمرے تک گئے اور دروازے پہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ ابو بھی بیمار ہونے کی وجہ سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ دونوں کو اشارے سے اندر بلایا۔ اندر آنے پر اٹھ بیٹھے اور ان کو پہلو میں بٹھا لیا۔ جاوید سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: "تمہیں یوں نہیں رونا چاہیے تھا۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے"۔ یہ کہہ کر دونوں کی پیشانیاں چوم لیں۔

ماں کی وفات کے بعد اقبال دونوں بچوں کا بہت زیادہ خیال رکھنے لگے۔ وہ دونوں بہن بھائیوں کو صبح سکول روانہ کرتے، واپس

آنے پر ان کی پیشانیاں چومتے۔ لیکن جاوید اپنی بہن سے اکثر لڑتا رہتا۔ جس کی وجہ سے ان کے ابو کو سخت تکلیف ہوتی۔ اسی وجہ سے جب بھی وہ سفر پر جاتے' جاوید کو اپنے ساتھ ساتھ رکھتے کہ کہیں گھر میں رہ کر اپنی بہن سے نہ لڑے۔ جس وقت وہ بھوپال کے سفر پر گئے تو جاوید کو بھی ساتھ لے گئے۔ کئی روز ریل گاڑی میں گزرے۔ وہاں انہوں نے اپنے دوست سر راس مسعود کے پاس تقریباً دو مہینے تک قیام کیا۔ اقبال رات کو کھانے کی میز پر جاوید کو سمجھاتے کہ چمچہ اس طرح پکڑنا ہے اور کانٹا یوں۔ بھوپال سے واپسی پر چند دن دہلی میں رہے۔ وہاں اقبال جاوید کو قطب مینار دکھانے لے گئے۔ ننھے جاوید کا دل اوپر چڑھنے کے لیے بیتاب ہونے لگا تو ابو سے کہنے بولا:

"ابو آئیں مینار پر چڑھ کر اوپر جائیں"۔ لیکن اقبال کہنے لگے:

تم جاؤ میں اتنی بلندی پر نہیں چڑھ سکتا اور جب اوپر پہنچو تو نیچے کی طرف مت دیکھنا۔ کہیں دہشت سے گر نہ پڑو"

اقبال جب کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہوتے تو کھانے تک کو بھول جاتے' کتاب ختم کر چکتے تو اپنے ملازم کو بلا کر پوچھتے "کیوں بھئی میں نے کھانا کھا لیا ہے؟"۔

دن گزرتے گئے اور جاوید کے ابو بڑھاپے کی طرف بڑھتے رہے۔ سر کے بال سفید ہو چکے تھے۔ ایک دن جاوید نے کہا۔ ابو آپ بالوں پر خضاب لگایا کریں تو مسکرا کر بولے: میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ جاوید نے پھر کہا کہ ابو ہم آپ کو جوان دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر انہوں نے خضاب لگانا شروع کر دیا۔

اس بات کو کئی سال گزر گئے۔ ایک رات عقیدت مندوں کے جمگھٹے میں ان کی چارپائی رکھی تھی۔ جاوید اندر آیا تو پہچان نہ سکے۔ بیماری کا بڑا سخت حملہ تھا' پوچھنے لگے "کون؟" "میں جاوید ہوں ابو جی"۔ یہ سن کر اقبال ہنس دیئے اور بولے "جاوید بن کے دکھاؤ تو جانیں!" پھر ساتھ بیٹھے اپنے دوست چوہدری محمد حسین کو کہا: چوہدری صاحب اسے جاوید نامہ کے آخر میں شامل دعا "خطاب بہ جاوید" ضرور پڑھوا دیجئے گا"۔ اس رات کئی ڈاکٹر آئے ہوئے تھے جو آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خطرے والی بات ہے۔ جاوید ابو کو ہشاش بشاش دیکھ کر بستر پر جا سویا۔ لیکن سحری کے قریب ان کے ملازم نے اٹھایا: جاؤ دیکھو تمہارے ابا جان کو کیا ہو گیا! یہ سن کر ننھے جاوید کی نیند اڑ گئی۔ گھر کے مختلف حصوں سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جاوید اگلے کمرے میں گیا تو اس کی بہن منیرہ چہرے کو ڈھانپے رو رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بھائی کا بازو پکڑ لیا' لڑکھڑاتے قدموں سے دروازے تک پہنچے۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کھڑکیاں کھلی اور گردن تک سفید چادر میں لپٹے اقبال لیٹے تھے۔ چہرہ قبلہ رخ تھا اور بالوں پر جاوید کے کہنے پر لگائے گئے خضاب کی ہلکی سی سیاہی تھی۔

منیرہ کی آنکھیں پرنم' ٹانگیں لرز رہی تھیں اور اس نے اپنے بھائی جاوید کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اس کی سسکیوں کی آواز جاوید کے کانوں تک صاف آ رہی تھیں۔ لیکن کوشش کے باوجود جاوید نہ رو سکا۔ اسے خوف تھا کہ اگر وہ رو دیا تو اقبال ابھی اٹھ کھڑے ہوں گے' انگلی کے اشارے سے دونوں کو قریب بلائیں گے اور جب وہ ان کے قریب جائیں گے تو دونوں کو ایک ایک پہلو میں بٹھا کر شفقت سے ان کے کندھوں پر ہاتھ پھیریں گے۔ پھر قدرے کرختگی سے جاوید کو کہیں گے "تمہیں یوں نہ رونا چاہیے۔ یاد رکھو تم مرد ہو اور مرد کبھی نہیں رویا کرتے"۔

☆☆☆

فرمودۂ اقبالؒ

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری

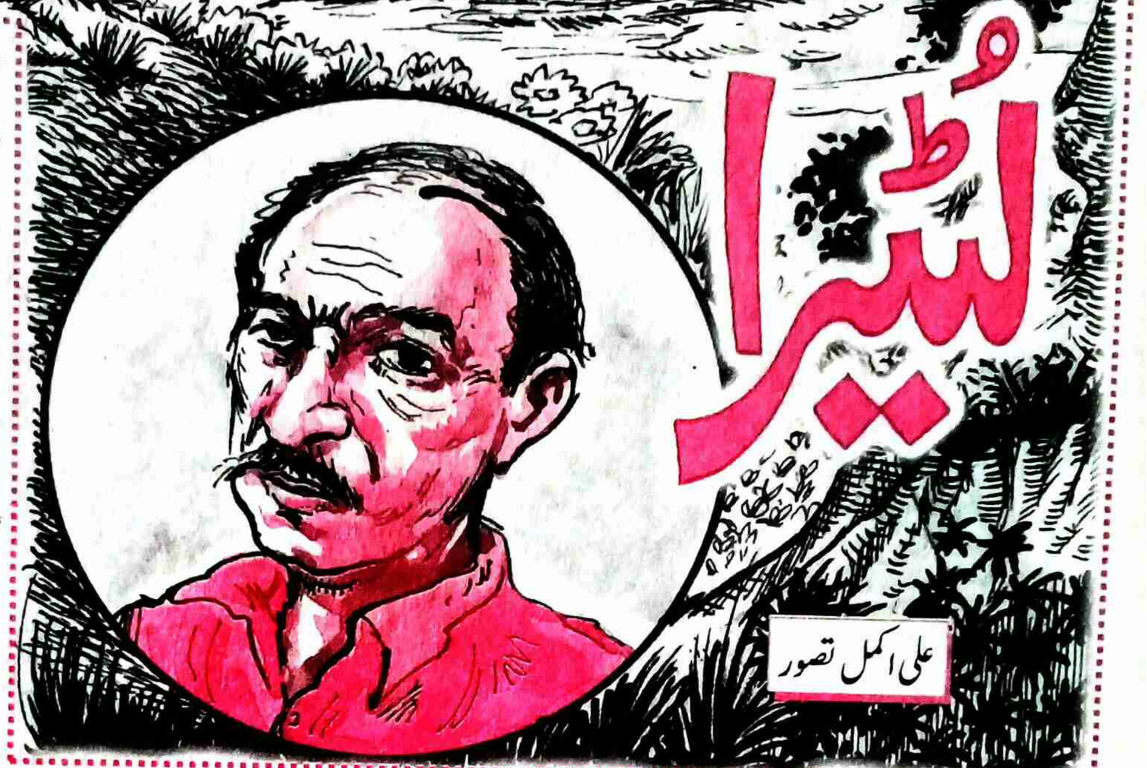

لٹیرا

علی اکمل تصور

کوئی اور وقت ہوتا تو اختر خوشگوار موسم کا بھرپور لطف لیتا۔ لیکن آج حالات سازگار نہیں تھے۔ وہ ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ اپنی دلی کیفیت سے تو بس وہی آگاہ تھا۔ تانگے میں سوار دوسرے مسافر خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے۔ تانگہ کچی سڑک پر ہچکولے کھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کوچوان اپنی پتلی چھڑی سے گھوڑے کو مسلسل ہانکے چلا جا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ گھوڑا ایک بار رک گیا تو بس پھر رک ہی جائے گا کیونکہ راستہ ناہموار تھا۔ پھر کوچوان کو ایک خوف بھی بے چین کر رہا تھا۔ یہ ایک ایسا خوف تھا جس میں تمام سواریاں مبتلا تھیں۔ وہ آپس میں اجنبی تو تھے لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ایک ہی گھر کے افراد ہوں۔ آسمان پر بادل پھیلے ہوئے تھے۔ سورج کبھی چھپ جاتا تھا کبھی نکل آتا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ راستہ دور تک ویران تھا۔ سڑک کے دونوں طرف زرعی زمین تھی۔ ہوا چلتی تھی تو فصلیں جھومنے لگتی تھیں۔ سامنے ملک کالے کا باغ نظر آ رہا تھا اور ان سب کو صرف اس باغ سے خوف آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف باغ پھیلا ہوا تھا۔ یہ باغ بہت گنجان تھا۔ جیسے جیسے تانگہ باغ کی طرف بڑھ رہا تھا ان سب کو چپ سی لگتی جا رہی تھی۔ خوف تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ کوچوان اب گھوڑے کو چابک مار رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ تیز رفتاری کے ساتھ باغ کی حدود میں سے نکل جائے لیکن گھوڑا بے چارہ کیا کرتا۔ ایک تو آٹھ سواریوں کا بوجھ دوسرا راستہ ناہموار۔ مار کھانے کے باوجود اس کی رفتار پہلے جتنی ہی تھی۔

تانگہ اب باغ کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف بانس کے گنجان پودے تھے۔ اوپر جا کر بانس آپس میں مل گئے تھے۔ سڑک پر جیسے چھت سی بن گئی تھی۔ یہاں روشنی نسبتاً کم تھی۔ اچانک تمام سواریاں سہم کر رہ گئیں۔ وہ کل پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے اپنے منہ اور سر ڈھانپ رکھے تھے۔ ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ انہوں نے آناً فاناً تانگے کو گھیر لیا۔ یہ ڈاکو تھے۔ نواب پور گاؤں کے تمام لوگ ان ڈاکوؤں کی وارداتوں سے پریشان تھے۔ یہ ڈاکو دن دہاڑے واردات کرتے تھے۔ مسافروں کو لوٹ لیتے تھے اور ملک کالے کے باغ میں ہی روپوش ہو جاتے تھے۔ اختر کبھی کبھار ہی گاؤں آتا تھا۔ اس نے ڈاکوؤں کے متعلق سن رکھا تھا۔ تاہم وہ خود ان حالات کا شکار ہو جائے گا یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دو ڈاکو سواریوں کی تلاشی لینے لگے۔ بے چارے دیہاتیوں کے پاس جو

تھوڑے بہت روپے تھے وہ ڈاکوں نے چھین لیے۔ اب ڈاکو اختر کی طرف بڑھے اختر کے پاس پانچ ہزار سے زیادہ کی رقم موجود تھی۔ اس نے مزاحمت کی تو ڈاکوؤں نے اسے کھینچ کر سڑک پر اتار لیا۔ ایک ڈاکو نے کوچوان کو جانے کا اشارہ کیا تانگہ آگے بڑھ گیا۔ ڈاکو اختر کو باغ میں کھینچ لائے۔ اختر کی بڑی حالت تھی۔ اختر پورا زور لگا رہا تھا اور ڈاکو اسے مار رہے تھے۔

"میں یہ رقم تمہیں نہیں دوں گا۔ یہ میری امی کے لیے ہے"۔ اختر کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان میں سے ایک ڈاکو دور کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے اس لوٹ مار میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ڈاکو اختر سے نقدی چھین چکے تھے۔ اتنے میں ایک ڈاکو کرخت لہجے میں بولا:

"چلو بھاگ نکلو یہاں تم ویسے کا کھانا کھانے نہیں آئے ہو......" اس کی بات سن کر سب گھنے درختوں کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اختر کراہتے ہوئے اٹھا اور سڑک پر چلا آیا۔ دکھ کی وجہ سے اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا لیکن اس نے صبر کر لیا۔ اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ آخر گرتا پڑتا گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسری طرف ڈاکو محفوظ مقام پر پہنچ چکے تھے اور اب انہوں نے اپنے ساتھی کو گھیر لیا تھا۔

"تم کبھی ڈاکو نہیں بن سکتے"۔ ڈاکوؤں کا سرغنہ بہت غصے میں تھا۔

"ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے تمہاری وجہ سے ہم کبھی بھی پکڑے جا سکتے ہیں"۔

"میری ضرورت مجھے تم لوگوں تک لے آئی تھی اور آج میں نے محسوس کیا ہے کہ میں بھی یہ لوٹ مار والا کام کبھی نہیں کر سکتا۔ تم لوگ میرا حصہ مجھے دے دو۔ میں واپس چلا جاتا ہوں" وہ سنجیدگی سے بولا۔ اس کی بات سن کر سب زور زور سے ہنسنے لگے۔

"حصہ...... کون سا حصہ؟"۔

"تم احمق ہو۔ تم نے کیا کیا ہے جو حصے کا مطالبہ کر رہے ہو۔ تمہارے لیے بہتر ہو گا کہ چپ چاپ واپس لوٹ جاؤ ورنہ ہم مل کر تمہاری حالت اس مسافر جیسی کر دیں گے جسے ہم نے باغ میں لوٹا تھا......" ان کے تیور بگڑ چکے تھے۔ اس مجبور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے زندگی میں پہلی بار گناہ کیا تھا۔ اس کی ضرورت نے اسے گناہ پر مجبور کر دیا تھا لیکن اس کی ضرورت پھر بھی پوری نہیں ہو پائی تھی۔ وہ کچھ سوچ کر اٹھ کھڑا ہوا ایسے میں ڈاکوؤں کا سرغنہ تیز آواز میں بولا:

"خبردار اگر کسی کو ہمارے متعلق بتایا۔ ہم تمہارے گھر کا پتا جانتے ہیں۔ تم نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم بھی فائدے میں نہیں رہو گے"۔ یہ دھمکی تھی جو اس نے سن لی تھی اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ ڈاکو بے ہنگم انداز میں قہقہے لگا رہے تھے اور وہ مردہ انداز میں چلتا ہوا اپنے گھر کی طرف واپس لوٹ رہا تھا۔ جہاں اس کی بیوی بے تابی سے اس کی منتظر تھی۔ اس کا اکلوتا بیٹا بیمار تھا۔ پچھلے ایک ہفتے سے اسے بخار تھا۔ دوا نہ ملنے کی وجہ سے بخار بگڑ گیا تھا اور اب اس کی آخری امید بھی دم توڑ گئی تھی۔

دوسری طرف اختر ابھی راستے ہی میں تھا کہ گاؤں والے

اس کی مدد کو آ پہنچے۔ سب سے آگے اختر کے ابو جی تھے۔ انہوں نے ایک مضبوط لاٹھی ہاتھ میں دبا رکھی تھی۔ وہ بہت غصے میں نظر آ رہے تھے۔ کوچوان نے اختر کے لٹنے کی خبر گاؤں والوں کو دی تھی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈاکو اس کی رقم چھین کر روپوش ہو چکے تھے۔ سانپ نکل گیا تھا۔ لیکن ابو کو اپنی مدد میں آتا دیکھ کر اختر کو ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوا۔ "بیٹے تم خیریت سے تو ہو"۔ اختر کے ابو نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"امی کی طبیعت اب کیسی ہے"۔ اختر نے پوچھا۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ تم خود کو تو سنبھالو میرے بچے"۔

"میں ٹھیک ہوں۔ مجھے امی کے پاس لے چلیئے......"

اختر کے ابو نے فون کر کے اختر کو گھر بلایا تھا۔ اس کی امی کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی تھی۔ گاؤں میں موجود ڈاکٹر نے جواب دے

دیا تھا۔ اسے تسلی بخش علاج کی ضرورت تھی اور یہ علاج شہر کے ہسپتال ہی میں ممکن تھا۔ اختر اسی لیے گاؤں آیا تھا۔ جو رقم اس کی امی کے علاج میں صرف ہونی تھی وہ ڈاکوؤں نے لوٹ لی تھی اور اب اختر اسی کے متعلق سوچ رہا تھا۔

اختر گاؤں میں پڑھا تھا۔ پھر اچھی تعلیم کی غرض سے وہ شہر آ گیا۔ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ شہر میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس نے ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت بھی کر لی تھی۔ اختر کی امی کو اکثر گردے میں درد کی شکایت رہتی تھی اور اب بیماری حد سے آگے بڑھ گئی تھی۔ ایسے میں اختر کو شہزاد یاد آ رہا تھا۔ شہزاد اس کے ساتھ کمپنی میں کام کرتا تھا اور اختر کو یقین تھا کہ شہزاد اس کی مدد ضرور کرے گا۔

اختر کی امی اسے اس حالت میں دیکھ کر تڑپ اٹھی۔ وہ روئے جا رہی تھیں ان کی درد کی شدت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اختر انہیں دلاسا دے رہا تھا۔ اگلی صبح انہیں لاہور روانہ ہونا تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ رات کو سونے کے لیے چارپائیاں صحن میں بچھا دی گئی تھیں۔ رات کے نو بجے تھے۔ سب سونے کے لیے لیٹ گئے۔ لیکن اختر کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بہت بے چین تھا۔ دن میں جو واردات اسے پیش آئی تھی۔ اسی کے مناظر کسی فلم کی طرح اس کے ذہن کے پردے پر چل رہے تھے۔ چار ڈاکو اسے لوٹ رہے تھے۔ گھسیٹ رہے تھے گھونسے مار رہے تھے اور ایک ڈاکو دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اختر اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ لوٹ مار میں وہ ڈاکو شریک کیوں نہیں ہوا؟ ایک سوال تھا جس نے اختر کو الجھا کر رکھ دیا۔ لیکن اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس موجود نہیں تھا۔

"چلو بھاگ نکلو...... یہاں تم ولیمے کا کھانا کھانے نہیں آئے ہو"۔ یہ آخری جملہ تھا جو اختر نے سنا تھا۔ کہنے والا شاید ڈاکوؤں کا سردار تھا۔ اس نے ایسا جملہ کیوں کہا۔ ایک اور سوال اختر کے سامنے ناچنے لگا اُس کے پاس اس سوال کا جواب بھی موجود نہیں تھا۔ کوئی بات تو ضرور تھی۔ ڈاکو ایسے تو نہیں ہوتے جیسا وہ ڈاکو تھا جو ڈاکوؤں کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ان میں شامل نہیں تھا اور جسے اس کا ساتھی طنزیہ لہجے میں کہہ رہا تھا کہ تم یہاں ولیمے کا کھانا کھانے نہیں آئے ہو۔ اختر اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ چونک

سا گیا۔ اس کے کانوں سے کسی کے رونے کی آواز ٹکرائی۔ اب وہ آواز بلند ہو گئی تھی۔ سب گھر والے نیند سے جاگ پڑے۔ اختر بہت ہراساں نظر آرہا تھا۔ رونے کی آواز پڑوس سے آرہی تھی۔

"کون رو رہا ہے ابو جی......" اختر نے پوچھا۔

"بیٹا وہ کاشف کی بیوی ہے۔ اس کا بچہ بہت دنوں سے بیمار ہے"۔

"ابو جی ہمیں چل کر خبر لینی چاہیے...... اختر نے کہا اور ساتھ ہی اس نے چپل پہن لیے۔

"ہاں بیٹے چلتے ہیں...... پھر دونوں گھر سے نکل پڑے۔ گلی کے آخر پر کاشف کا نیم پختہ مکان تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ محلے کے چند اور لوگ بھی گھر میں موجود تھے۔ کاشف کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور ایک پیارا سا بچہ چارپائی پر بے ہوش پڑا تھا۔ پاس ایک جوان آدمی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ کاشف تھا۔ ابو جی نے اس کا شانہ تھپتھپا کر کہا:

"غم مت کرو۔ بچہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اللہ خیر کرے گا......" کاشف نے سر اٹھایا۔ وہ بہت غم زدہ نظر آرہا تھا۔

"دوا ملے گی تو آرام آئے گا اور مجھے تو کام ہی نہیں ملا"۔

"ہمت نہیں ہارتے۔ زندگی تو آزمائش کا دوسرا نام ہے۔ اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے اور اکثر یہ امتحان اولاد کی صورت میں ہوتا ہے۔ کیونکہ والدین سب سے زیادہ اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ کا امتحان بھی تو لیا تھا۔ وہ بھی اس امتحان میں سرخرو ہوئے تھے۔ تمہیں بھی سرخرو ہونا ہے"۔

"افسوس میں اس امتحان میں ناکام ہو گیا......" غم کی شدت سے کاشف کی آواز بوجھل ہو گئی۔ لیکن اس کی بات کا مطلب کوئی نہیں سمجھ پایا تھا۔ ایسے میں اختر آگے بڑھا۔ اس نے بے ہوش بچے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور پھر کچھ سوچ کر بولا:

"بچے کو تیز بخار ہے۔ آپ ٹھنڈا پانی لیں اور کپڑے کی پٹیاں بھگو کر اس کے جسم پر رکھیں۔ صبح ہمیں شہر جانا ہے آپ بھی ہمارے ساتھ چلیے۔ بچے کا علاج ہسپتال میں ہو گا تو یہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ علاج کا خرچ میں ادا کروں گا"۔ اختر کی بات سن کر کاشف کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس کی بیوی کی سسکیاں رک گئیں۔ اس مشکل وقت میں اختر کی بات نے انہیں بڑی تقویت دی تھی۔ کاشف اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اختر کے ہاتھ تھام لیے۔

"آپ کا احسان......" کاشف کی بات گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ اس نے پہلی بار اختر کو غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرانی سے پھیلتی چلی گئیں۔ دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا ہو۔ پھر اس کا سر جھک گیا۔

"کیا ہوا...... خیریت تو ہے"۔ اختر بے چین ہو گیا۔ کاشف نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"آپ بہت عظیم ہیں۔ اپنوں کے ساتھ ساتھ غیروں پر بھی مہربان ہے اور میں...... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی پھر ڈوبی ہوئی آواز میں بولا:

"اور میں...... میں ایک لٹیرا ہوں۔ جن ڈاکوؤں نے آپ کو لوٹا تھا ان میں میں بھی شامل تھا۔ میری ضرورت نے مجھے گمراہ کر دیا تھا۔ مجھے معاف کر دیجیے"۔ ندامت کے آنسو تھے کہ اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ اختر گم سم سا اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے تک جن سوالوں نے اسے الجھا رکھا تھا۔ اسے ان سوالوں کے جوابات ایسے انوکھے انداز میں ملیں گے' اس نے کب سوچا تھا۔ اللہ کی قدرت نرالی ہے۔ وہ اپنی مخلوق پر بڑا مہربان ہے۔ لیکن صرف اُس پر جو اس کی مخلوق پر مہربان رہتا ہے۔ اختر کے پیار بھرے رویے نے کاشف کو سیدھا راستہ دکھا دیا تھا۔

کاشف کہہ رہا تھا: "آپ پولیس کو ساتھ لیجیے میں ڈاکوؤں کی نشاندہی کروں گا۔ آپ کی رقم آپ کو واپس ملے گی اور گاؤں والے امن سے سفر کر سکیں گے۔ میرے ساتھ چلیے" پھر کاشف کے ساتھ سب گاؤں والے پولیس سٹیشن پہنچے راتوں رات ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ اختر کی رقم بھی برآمد ہو گئی۔ پھر اگلی صبح اختر اپنی امی' کاشف اور اس کے بیمار بچے کے ہمراہ شہر کو روانہ ہوا۔ کوچوان تانگے کو ہانک رہا تھا۔ سامنے ملک کالے کا باغ نظر آرہا تھا۔ ایسے میں سب ہی مطمئن تھے۔ اب کسی کو لٹنے کا خوف بے چین نہیں کر رہا تھا۔

☆☆☆

رہتاس کی سیر

فرحت جبیں

"ارے ارے دھیان سے کھاؤ' آئس کریم گر رہی ہے!" جمشید انکل نے فرحان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا جو حمزہ' عائشہ' لائبہ اور طلحہ سے باتیں کرنے میں اتنا منہمک تھا کہ ہاتھ میں پکڑی ہوئی آئس کریم کون کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ دوسری طرف فرحان کی امی مسز جمشید کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھیں۔ صرف انکل جمشید تھے جو کچھ دور بیٹھے بازار کی گہما گہمی اور بچوں کی خوش گپیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"جی انکل!" یہ کہتے ہوئے فرحان کو آئس کریم کا خیال آیا' تو کچھ قطرے اس کی شرٹ پر گر چکے تھے' "اوہو' ہو...... انکل آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا!" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ننھی لائبہ تو ہنستے ہنستے دوہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ "لو جی' بھائی کی آئس کریم گر گئی۔ شیم شیم شرٹ بھی گندی ہو گئی" اتنے میں جمشید انکل نے آگے بڑھ کر فرحان کو ٹشو پیپر دیا شرٹ کی صفائی کے لیے۔

"چلو بیگم جلدی کرو۔ بھئی دیر ہو رہی ہے۔ تھوڑا بہت سفر ابھی باقی ہے۔ واپس بھی لوٹنا ہے۔ باتوں میں وقت نہ ضائع کریں۔ چلو چلو! بس کرو اپنی گپ شپ اپنی سیٹوں پر بیٹھو جا کر!" یہ کہتے ہوئے جمشید انکل نے بیرے کو بل کی ادائیگی کرتے ہوئے اچھی سی ٹپ بھی دی۔ وہ خوش ہو کر بولا: "صاحب جی واپسی پر یہاں سے ضرور ہوتے جایئے گا۔ تربیلا جھیل کی مسالے دار مچھلی ہمارے یہاں ایسی تیار ہوتی ہے کہ آپ مدتوں یاد رکھیں گے' جناب!"

"ضرور آئیں گے بھئی ضرور آئیں گے دوبارہ" انکل نے اسے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں بچہ لوگ کار میں سوار ہو چکے تھے۔ سوار کیا ہوئے' یوں کہیے کہ ٹھونسے ہوئے تھے۔ فرحان کی امی اور آنٹی پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئیں لائبہ اور عائشہ بھی ان کے ساتھ تھیں جبکہ فرحان' حمزہ اور طلحہ جیسے تیسے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ جمشید انکل نے گاڑی سٹارٹ کی اور اگلے موڑ سے ہوتے ہوئے ایک بغلی سڑک پر ہو لیے۔

یہ قافلہ دراصل سیر و سیاحت کی غرض سے رات لاہور سے چلا تھا۔ علی الصبح "دینہ" پہنچے۔ "دینہ" جہلم کے قریب ہی ایک چھوٹا سا پر رونق قصبہ ہے۔ یہاں سے ایک سڑک منگلا کی طرف نکلتی ہے اور ایک قلعہ روہتاس کی طرف۔ ان ننھے منے سیاحوں نے انکل جمشید کی سربراہی میں یہیں ایک اچھے سے ہوٹل میں کچھ دیر قیام کیا۔ فریش ہوئے' منہ ہاتھ دھویا اور پھر بڑے ٹھاٹھ کا انڈوں پراٹھوں والا ناشتا کیا۔ بعد میں جمشید انکل نے حسب وعدہ آئس کریم بھی کھلائی۔

جمشید صاحب کینیڈا میں ہوتے ہیں۔ گزشتہ ماہ سے اپنے بچوں' حمزہ اور عائشہ کے ساتھ لاہور اپنے بڑے بھائی نوید صاحب کے ہاں آئے ہوئے ہیں۔

فرحان' لائبہ اور طلحہ کی تو گویا عید ہو گئی۔ سکول سے تو چھٹیاں تھیں ہی اوپر سے جمشید انکل' آنٹی اور حمزہ' عائشہ کے آجانے

پر اور بھی وارے نیارے ہو گئے۔ فرحان کے ابو ایک ایڈور ٹائزنگ کمپنی میں چیف ڈیزائنر کے طور پر کام کرتے ہیں۔ ایک روز باتوں ہی باتوں میں رات کے کھانے پر سیر سپاٹے کا پروگرام بن گیا۔ جمشید انکل تو جب بھی پاکستان آتے ہیں بچوں کو خوب سیر کراتے ہیں۔ سیر و سیاحت کا پروگرام تو تھا ہی البتہ یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ اس بار کہاں کی سیر کی جائے۔ کافی دیر صلاح مشورے ہوتے رہے۔ آخر نوید صاحب نے قلعہ رہتاس دیکھنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے قلعے کی چند تصویریں بھی دکھائیں جو ان کی کمپنی نے اشتہار کے لیے بنائی تھیں۔ "بچہ پارٹی" نے یک زبان ہو کر ان کے مشورے کو نہ صرف پسند کیا بلکہ ہاتھ کھڑے کر کے "قلعہ رہتاس" کے حق میں فیصلہ دیا...... اور اب یہ "سیاح لوگ" انکل جمشید کی رہنمائی میں قلعہ رہتاس دیکھنے کے لیے رواں دواں تھے۔

راستے میں انکل جمشید بتانے لگے: بھئی کالج میں پڑھتا تھا جب ہمارا اسٹڈی ٹور رہتاس قلعے کی سیر کے لیے آیا تھا۔ قلعہ رہتاس جی ٹی روڈ کے کنارے دینہ قصبے سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ آپ لوگ جانتے ہی ہوں گے کہ جی ٹی روڈ کس بادشاہ نے تعمیر کرائی تھی۔

"جی انکل! شیر شاہ سوری نے!" فرحان نے فوراً جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک! یہ عظیم شاہراہ برصغیر پاک و ہند کے افغان حکمران شیر شاہ سوری نے کلکتہ سے پشاور تک تعمیر کرائی تھی۔ اسے جی ٹی روڈ (گرینڈ ٹرنک روڈ) کے علاوہ جرنیلی سڑک بھی کہتے ہیں۔ میرے بچو! شیر شاہ سوری ایک بہادر، منتظم اور انصاف پرور بادشاہ تھا۔ اس نے مسافروں کے آرام کے لیے اس سڑک کے ساتھ ساتھ بہت سی سرائیں بھی تعمیر کرائیں۔ ڈاک کا بہترین نظام قائم کیا۔ جہلم کے سیاہ پہاڑی سلسلے میں روہتاس کا مضبوط قلعہ آج بھی شیر شاہ سوری کی جنگی حکمت عملی اور اس کے جاہ و جلال کا منہ بولتا ثبوت ہے"۔

"انکل! روہتاس کچھ عجیب سا نام نہیں؟" عائشہ کچھ حیران سی ہو کر بولی۔ جمشید انکل نے گاڑی ذرا آہستہ کرتے ہوئے جواب دیا: عاشو رانی! روہتاس دراصل سنسکرت زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں سفید انڈا۔ اس قلعہ کی بناوٹ انڈے سے کافی مشابہت رکھتی ہے اور پھر اس کی تعمیر میں ایک خاص قسم کا سفید مسالہ استعمال کیا گیا ہے ہو سکتا ہے ان وجوہات کی بنا پر اس قلعے کو "روہتاس" کا نام دیا گیا ہو۔ ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ اس قلعے کی تعمیر کا آغاز ستمبر 1542ء میں ہوا۔ یہ قلعہ چونکہ اپنے ڈیزائن، تعمیری زاویوں، فوجی نظم و نسق اور محل وقوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے اس لیے اس پر آج تک بہت تحقیقی کام ہوا ہے۔ ملکی و غیر ملکی طالب علموں اور سیاحوں کے علاوہ یہاں ریسرچ سکالرز بھی اکثر آتے رہتے ہیں"۔

"آج ہم تو اس کو دیکھنے کے لیے جا رہے ہیں نا" ننھی لائبہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں بیٹا! وہ دیکھو برساتی نالے کے اس پار جو کبھی اچھا خاصا دریا تھا، قلعہ رہتاس کس آن بان سے ہمارے شاندار ماضی کی شہادت پیش کر رہا ہے"۔ جمشید انکل نے دائیں طرف ہاتھ کا اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "لو جی! اب ہم قلعے تک پہنچنے ہی والے ہیں۔ باقی باتیں سیر کے دوران بتاؤں گا تمہیں"۔ جمشید انکل نے گاڑی آہستہ چلاتے ہوئے ترائی عبور کی۔ پل پر سے گزرتے ہوئے آسانی سے دوسری طرف پہنچ گئے اور پھر ننھے سیاحوں کا قافلہ جمشید انکل کی رہنمائی میں قلعے کی سیر میں مصروف ہو گیا۔ قلعے کے کھنڈرات، مضبوط اور موٹی دیواریں، سیڑھیاں اور دیو قامت دروازے بلاشبہ عظیم الشان ماضی کی یاد تازہ کر رہے تھے۔ جمشید انکل نے ایک مقامی گائیڈ کو بھی اپنی رہنمائی کے لیے ساتھ لے لیا جو قدم قدم پر معلومات فراہم کرتا جا رہا تھا۔

"جناب! تقسیم ملک سے پہلے انگریزی دور میں اس قلعے کی لاگت کا اندازہ لگایا گیا تھا جو اس وقت کے سکے کے حساب سے اکیس کروڑ پچھتر ہزار بنتا تھا۔ اس تاریخی قلعے کی تعمیر تقریباً آٹھ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی تھی"۔ گائیڈ نے قلعے کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ "قلعے کی فصیل یعنی بیرونی دیوار 90 سے 100 فٹ تک بلند ہے۔ اس پر پانچ مختلف جگہوں پر نقار خانے بنائے گئے ہیں۔ پورے قلعے کے 481 برج اور 1900 کنگرے ہیں۔ ان کنگروں میں تیر اندازوں کے لیے مورچے بنائے گئے تھے۔ پورا قلعہ دو مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ قلعے کے اندر عالی شان محلات بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔ ان محلات میں "سفید

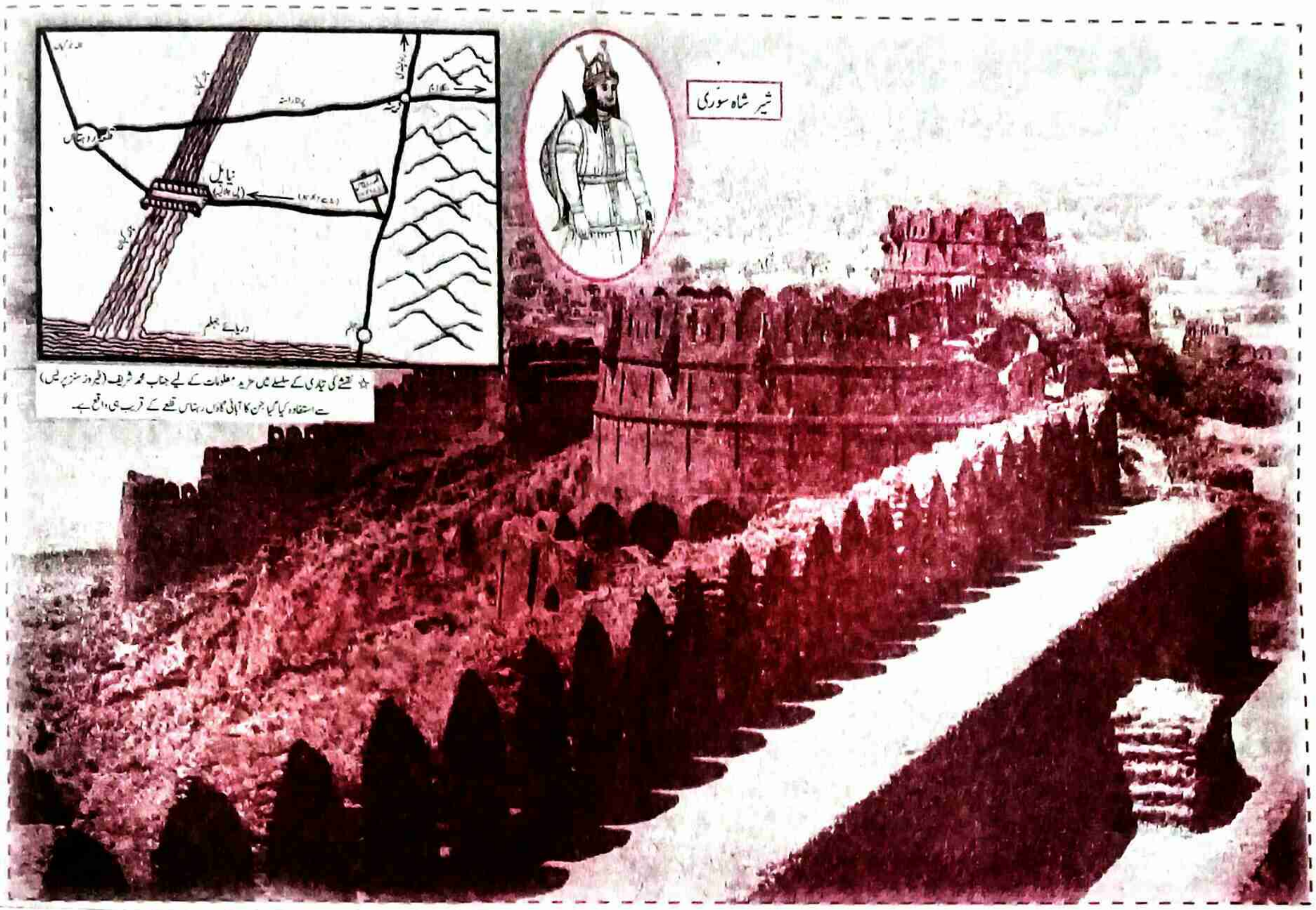

☆ قلعے کی تیاری کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے جناب محمد شریف (فیروز سنز پریس) سے استفادہ کیا گیا جن کا آبائی گاؤں، رہتاس قلعے کے قریب ہی واقع ہے۔

محل" اپنی خوبصورتی اور نفاست کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ یہ خوبصورت محل 25 ایکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور سطح سمندر سے 2660 فٹ بلند ہے"۔

بچے بڑی دلچسپی سے قلعے کے مختلف حصے دیکھ رہے تھے۔ سفید محل واقعی انہیں بے حد پسند آیا۔ گائیڈ انہیں بالائی منزل پر بھی لے گیا جہاں خوبصورت جھروکوں میں سے دور تک خوبصورت مناظر نظر آتے تھے۔ انکل جمشید نے محل کے بلند و بالا مینار بھی دکھائے۔ گائیڈ نے "رانی محل" بھی دکھایا جو کسی زمانے میں واقعی بہت خوبصورت ہو گا تاہم اب کافی حد تک بدل چکا ہے۔ سیر کے دوران جمشید انکل کیمرے سے تصویریں بھی لیتے جا رہے تھے۔

"قلعہ رہتاس کے کل بارہ دروازے ہیں جن میں سے کچھ ٹوٹ چکے ہیں"۔ گائیڈ ساتھ ساتھ بتاتا جا رہا تھا۔ "شاہی دروازے کے ساتھ مسجد ہے جس کی محراب اور اس کے آس پاس دیواروں پر قرآنی آیات لکھی گئی ہیں۔ کسی ناگہانی آفت کی صورت میں کسی دوسرے محفوظ مقام یا قلعے میں پناہ لینے کے لیے تین خفیہ راستے بھی ہیں۔ پانی کی رسد کے لیے گہری کھدائی کر کے باؤلیاں بنائی گئی ہیں جن میں اترنے کے لیے پانی کی تہہ تک لاتعداد سیڑھیاں جاتی ہیں۔ بابو جی! قلعے کی پشت پر "کالا چٹا" پہاڑ ہے جس پر 12 کلو میٹر کے فاصلے پر "ٹلہ جوگیاں" ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے 3242 فٹ ہے۔ روایت ہے کہ مشہور مسلمان سیاح اور جغرافیہ دان البیرونی نے اسی ٹیلے پر بیٹھ کر الجبرے کی مدد سے زمین کا محیط اور قطر معلوم کیا تھا"۔

قلعے کی سیر سے بچے خاص طور پر بڑے محظوظ ہوئے۔ چلتے پھرتے پتا ہی نہ چلا کہ شام کے سائے بڑھنے لگے۔ دھوپ بھی خوب چمک رہی تھی۔ آخر ایک طرف کھلی جگہ پر چٹائی بچھا کر سب نے کھانا کھایا۔ دوپہر کا کھانا جمشید انکل نے دینہ ہی سے تیار کروا کر ساتھ رکھ لیا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں جبکہ فرحان کی امی اور آنٹی نے کچھ دیر سستا لیا۔ عائشہ کچھ زیادہ ہی تھک چکی تھی۔ بہرحال جونہی ذرا شام گہری ہوئی جمشید انکل سب کو ساتھ لیے گاڑی کی طرف آئے اور پھر جلد ہی قلعہ روہتاس کو الوداع کہتے ہوئے واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

☆☆☆

صحت کی حفاظت

سید جاوید امتیازی

روزمرہ زندگی: مہلک اثرات کی زد میں!

اس کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں تھی‘ یہی کچھ پچاس پچپن برس ہو گی مگر کچھ عرصے سے اس کی صحت تیزی سے گرتی چلی جا رہی تھی۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ وہ خود بھی ایک اچھا ڈاکٹر تھا اور ہزاروں لوگوں کا علاج کر چکا تھا مگر آج اُسے اپنی بیماری کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا اور نہ ہی کسی دوسرے معالج کی سمجھ میں اس کی بیماری آ رہی تھی۔ وہ شدید جسمانی کمزوری کا شکار تھا۔ نیند اڑ چکی تھی۔ پٹھوں اور بازوؤں میں کھچاؤ‘ ناقابل برداشت سر درد‘ آنتوں میں اینٹھن کے علاوہ پیٹ درد‘ قے اور دست کی شکایت عام رہنے لگی تھی۔ ان ساری تکلیفوں کی وجہ سے وہ بے حد چڑ چڑا ہو گیا تھا۔ بھوک تقریباً ختم ہو چکی تھی اور ایک ہی ماہ میں دس پونڈ وزن کم ہو گیا تھا۔ بہت سے ڈاکٹروں کو دکھایا‘ علاج کرایا مگر بیماری بڑھتی ہی جا رہی تھی...... اُسے کیا معلوم تھا کہ اس کی تمام بیماری کی اصل وجہ چینی کی وہ پیالی تھی جسے اس کے بیٹے نے اسے تحفے کے طور پر بھیجا تھا۔

جی ہاں! صرف اور صرف چینی کی وہی پیالی بیماری کی اصل جڑ تھی جس میں وہ اکثر چائے اور دوسرے مشروبات بڑی خوشی اور چاہت سے پیا کرتا تھا۔ اس بات کا پتا اُس وقت چلا جب ڈاکٹروں نے اس کے معمولات یعنی کھانے پینے اور استعمال میں آنے والے برتنوں کا جائزہ لیا۔ راز یہ کھلا کہ چینی کی اس پیالی میں کچھ ایسے رنگ و روغن سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے جس میں سیسے کی آمیزش تھی۔ جب وہ اس میں مشروبات ڈال کر پیتا تو سیسے کی کچھ نہ کچھ مقدار حل ہو کر اس کے معدے میں چلی جاتی اور یوں اس کے جسم میں سیسے کا زہر آہستہ آہستہ پھیلتا چلا گیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بروقت اس کے مرض کی تشخیص ہو گئی اور وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گیا۔

سیسہ دراصل نہایت زہریلے اثرات کا حامل ہے۔ مگر چونکہ چینی اور مٹی کے برتنوں کی پالش اور ان کی آرائش کے لیے جو روغن استعمال کیے جاتے ہیں ان میں سیسے کے اوکسائیڈز کی بھاری مقدار شامل ہوتی ہے‘ اس لیے روزمرہ انسانی زندگی ان کے مہلک اثرات کی زد میں رہتی ہے۔ صرف امریکا میں برتن سازی کی صنعت میں چالیس سے پچاس ساٹھ ہزار ٹن تک سیسہ استعمال ہوتا ہے۔

پیارے بچو! شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ بسوں‘ رکشاؤں اور ویگنوں کے دھوئیں میں سیسے کی مقدار سب سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ سانس کے ذریعے جب ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچتا ہے تو خطرناک بیماریوں کا باعث بنتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جن شاہراہوں پر ٹریفک زیادہ ہوتی ہے اس کے گرد و پیش میں اگنے والی فصلیں ٹریفک کے کثیف دھوئیں اور اس میں شامل سیسے کی وجہ سے کافی حد تک زہر آلود ہوتی ہیں اور ان میں سرایت کر جانے والی سیسے کی مقدار مہلک بیماریوں کا موجب بنتی ہے۔ انسانی جسم میں سیسہ خون میں شامل ہوتا رہتا ہے اور اس کی زیادتی ہڈیوں اور جوڑوں کو متاثر کرتی ہے‘ اعصابی نظام کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے اور نظر کی کمزوری‘ رعشہ اور فالج جیسے موذی امراض کا موجب بنتی ہے۔ طبی لحاظ سے دیکھا گیا ہے کہ ایسی غذا جس میں کیلشیم اور وٹامن بی زیادہ ہوں‘ سیسے کے زہر کو ختم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ بظاہر کسی واضح بیماری کے بغیر اچانک اموات کی 80 فی صد وجہ سیسے کا زہر ہے۔

روزمرہ زندگی میں ماحولیاتی آلودگی جس میں سب سے زیادہ حصہ ٹریفک کے دھوئیں کا ہے‘ سیسے کے زہر کی وجہ سے ہماری صحت کی اصل دشمن ہے مگر ہم ہیں کہ زندگی کے اس دشمن سے عام طور پر غافل رہتے ہیں۔ آیئے ماحولیاتی آلودگی کا سدباب کریں اور انسانیت کو سیسے کے زہر کی ہلاکت آفرینی سے بچائیں۔ دھوئیں کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔ شجرکاری اور صفائی کے ذریعے ماحول کو خوشگوار بنائیں اور بہتر غذا کے استعمال سے صحت کی حفاظت کریں۔...... پیارے بچو! ہماری یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے گا!

"تمہارا کیا نام ہے؟"

"دولت! اور تمہارا؟"

"بینش!

"بی نش؟ اس کا کیا مطلب ہے؟"

"دانائی، ہوشیاری!"

"تمہارا یہ نام کس نے رکھا تھا؟"

"میری امی نے!"

"وہ کہاں ہیں؟"

"میں جب چھوٹی سی تھی تو اللہ میاں نے انہیں بلا لیا! تمہاری امی کہاں ہیں؟"

"پپا کہتے ہیں کہ مما امریکا میں رہتی ہیں۔ وہ وہاں پڑھ رہی ہیں!"

"اچھا...... آ...... آ! تمہیں ناشتا کھانا کون دیتا ہے؟"

"پپا نے تین چار عورتیں اور مرد سرونٹ جو رکھے ہوئے ہیں!"

"اوہ!"

میرے بنگلے میں چلو ناں! وہاں بہت ساری چیزیں دکھاؤں گی تمہیں!

"ابھی نہیں، پھر کبھی!"

"اچھا تو آج سے میری، تمہاری دوستی پکی!"

"سچ!؟"

"سچ نہیں تو اور کیا!"

"بابا! یہ ساتھ والے بنگلے میں دولت رہتی ہے!"

""بنگلوں میں دولت ہی رہتی ہے جان پدر! مگر تمہیں یہ عجیب بات کس نے بتائی؟"

"کسی نے بھی نہیں بابا! اس بنگلے میں میری ہم عمر لڑکی رہتی ہے،اس کا نام دولت ہے!"

"اچھا...... اب سمجھا! وہ تم سے کب ملی؟" "آج بابا، ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ وہ کہہ رہی تھی بنگلے میں چلو، اچھی اچھی چیزیں دکھاؤں گی"۔

"ناں...... میری بینو، ناں! یہ غریبوں کے دشمن نہیں تو

دوست بھی نہیں ہوتے!"

"کیوں بابا؟ دولت تو کہہ رہی تھی کہ آج سے ہم دونوں، ایک دوسرے کی پکی دوست ہیں!"

"یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں بیٹے!"

"بابا! ہمارے والا یہ کمرہ کب پکا بنے گا؟"

"بن جائے گا میری جان، بینش بیٹے! جب اللہ میاں چاہیں گے!"

"اللہ میاں کب چاہیں گے بابا؟"

"تمہیں نیند نہیں آ رہی بیٹا؟"

"نہیں بابا...... میں کل دولت کے پاس جاؤں گی"۔

"اچھا، اب تو سو جاؤ!"

"پپا! آج میں نے بینش کو اپنی پکی دوست بنا لیا!"

"کیا...... کون بینش؟"

"یہ ہمارے بنگلے کے ساتھ والے مکان میں رہتی ہے!"

"اوہ ڈیم! خوب کان کھول کر سن لو۔ اب سے بنگلے سے باہر قدم نہ نکالنا...... اچھا!"

"کیا ہو جائے گا پپا؟"

"خبردار! غریب، حقیر بچوں کے ساتھ تمہیں کھیلنے کی کوئی ضرورت نہیں!"

"پھر میں اکیلی دن بھر کیا کروں؟"

"چلو...... اپنے بیڈ روم میں جا کر سو جاؤ!"

"بینش! یہ دیکھو اڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلیاں!"

"دولت! تمہارا باغ تو پھولوں سے بھرا پڑا ہے!"

"ارے! یہ مچھلی گھر بھی تو دیکھو! کتنا خوب صورت ہے!"

"ہائے اللہ! کتنا پیارا ہے! یہ کون لایا؟"

"میرے پپا لائے۔ پانچ ہزار روپے کا ہے!" پانچ ہزار روپے کا؟ ایک ہزار...... دو ہزار...... تین ہزار...... چار ہزار...... پانچ ہزار...... پورے پانچ ہزار کا مچھلی گھر!"

"اب ذرا تم میرے کمرے میں تو چلو! یہ دیکھو...... کتنی پیاری پیاری گڑیاں ہیں! ہنستی، بولتی گڑیاں! سوتی جاگتی گڑیاں!" "واہ! کتنے اچھے اچھے، عمدہ عمدہ کپڑے اور فراک ہیں ان کے؟"

"کیا تمہارے پاس کوئی گڑیا نہیں ہے؟"

"میرے بابا تو مجھے...... "میری پیاری گڑیا" کہہ کے پکارتے ہیں!"

"اچھا...... تو یہ لو دو گڑیاں میری طرف سے "گفٹ" کے طور پر!"

"دولت! تم کتنی اچھی دوست ہو!...... یہ مشین کیسی ہے؟"

"یہ وڈیو گیم کی مشین ہے۔ آؤ دکھاؤں تمہیں!"

"واہ وا! وہ ہوائی جہاز آیا، ارے! اس پر تو فائر ہو گیا! یہ کیا...... اتنے سارے آدمی کہاں سے آ گئے؟ دولت...... دولت!

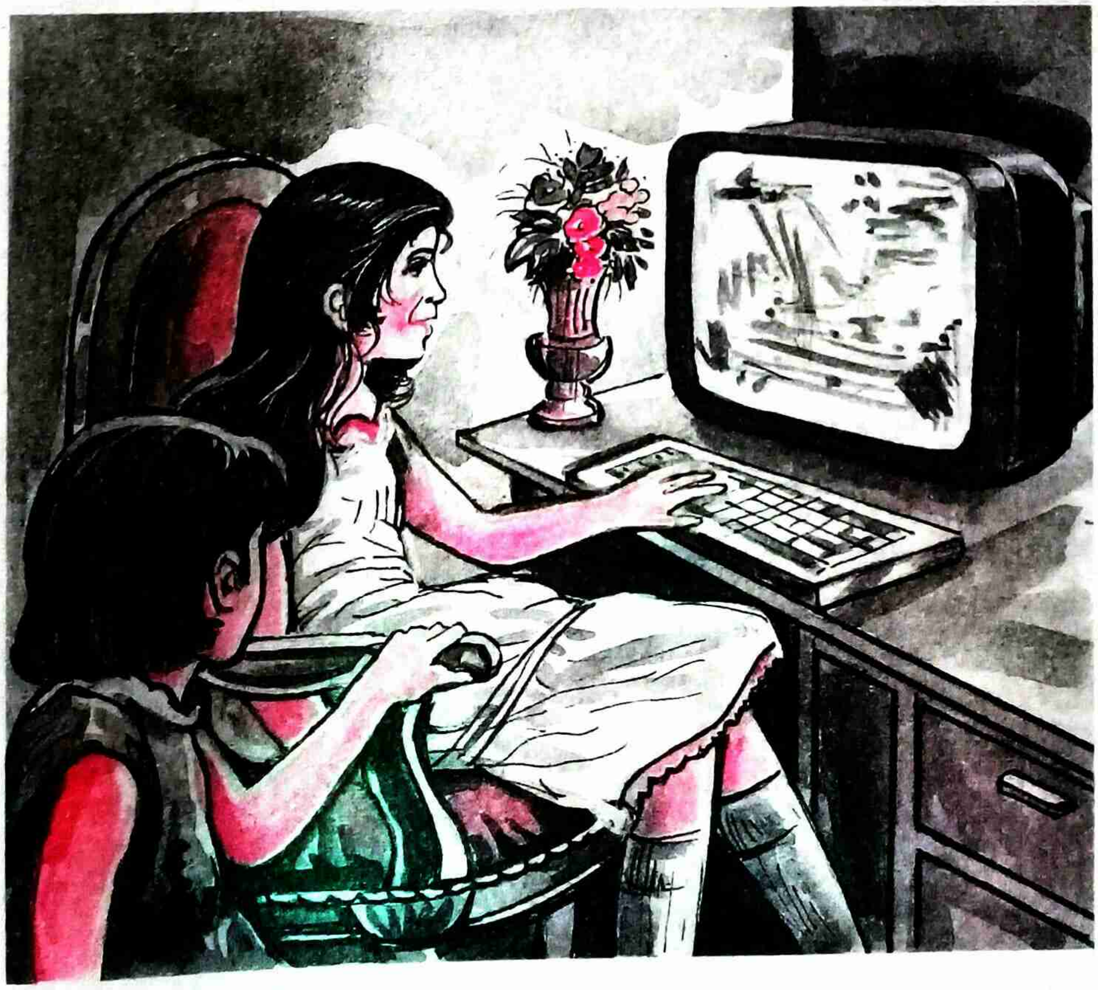

دیکھو وہ لڑکی سمندر میں گر گئی! بڑا سا مگرمچھ آرہا ہے تیزی سے......
وہ اسے کھا جائے گا؟ ہائے! وہ بچاری لڑکی!

"دولت بے بی! صاحب آگئے ہیں!"

"تو کیا...... چلو تم جاؤ یہاں سے!"

"دولت! دولت بے بی!"

"یس پپا! جسٹ کمنگ!"

"دولت! یہ تم نے کس لڑکی کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے؟ کون ہے یہ؟"

"یہی تو ہے' پپا...... میری دوست بینش...... پڑوس میں رہتی ہے!"

"نان سینس! اے چھوکری! چل بھاگ یہاں سے!...... اور یہ گڑیاں کہاں لیے جا رہی ہے؟"

"پپا! یہ گڑیاں میں نے اسے گفٹ کی ہیں...... آؤ بینش! تمہیں گیٹ تک چھوڑ آؤں!"

"بابا! دولت میری بہت اچھی' پکی سہیلی ہے۔ دیکھیں' اس نے یہ دو گڑیاں تحفے میں دی ہیں؟"

"تم تو پگلی ہوئی جا رہی ہو! یہ لوگ' یہ بنگلوں میں ٹھاٹ باٹ سے رہنے والے امیر لوگ...... یہ دولت والے' کبھی کسی کے سنگی ساتھی نہیں ہوتے بیٹا بینش!"

"بابا! میری دوست دولت کے بابا اچھے نہیں ہیں...... مجھے بہت ڈانٹا ڈپٹا! وہ تو دولت آڑے آگئی!"

"میں تم سے ہمیشہ کہتا ہوں کہ وہاں مت جاؤ...... یہیں کھیل کود لیا کرو"۔

"بابا! ادھر بھی بنگلے' ادھر بھی بنگلے...... بس ایک ہمارا یہ چھوٹا سا پلاٹ بیچ میں ہے' اس میں بھی ادھورا کمرہ بنا ہوا ہے...... میں کس سے کھیلا کروں؟"

"او بھائی! تم اپنا پلاٹ بیچ کر یہاں سے چلے جاؤ...... منہ مانگے پیسے لے لو!"

"نہیں' سیٹھ صاحب! یہ میرے مرحوم باپ کی نشانی ہے۔ مجھے پیسا ویسا نہیں چاہیے۔ اپنے پاس ہی رکھیں!"

"دیکھو! اپنی بیٹی کو بنگلے جانے سے منع کرو۔ اب کے بنگلے کے اندر آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا اس کی!"

"اچھا سیٹھ صاحب! سختی سے منع کر دوں گا اسے!"

"بینش' بینش! کم آن بھئی...... گھر سے باہر نکلو ناں!"

"بے بی! آپ سے اب نہیں کھیلے گی!"

"کیا؟ کیوں نہیں کھیلے گی وہ انکل؟"

"سیٹھ صاحب نے حکماً کہا ہے کہ اگر وہ بنگلے کے اندر آئی تو اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا!"

"اچھا...... تو پپا نے یہ بات کہی ہے' انکل؟ آپ میری فرینڈ کو تو باہر بھیجیں! میرا دل بہت اداس ہو رہا ہے اس کے بغیر!"

"بے بی! ہم غریبوں پر رحم کریں!"

"میں آج بینش کو اپنے ساتھ اپنے بیڈ روم میں سلاؤں گی۔ آپ اجازت دیں!"

دولت بے بی! اس کی ٹانگیں"۔

"پہلے میری ٹانگیں ٹوٹیں گی...... بینش! باہر آؤ بھئی! یہ دیکھو! آج شاپنگ کرنے گئی تھی! تمہارے لیے اپنی جیسی بائیسکل لائی ہوں...... آؤ' دیکھو! کتنی خوب صورت ہے! انکل! یہ پکڑیں سائیکل! میں بینش کو اپنے ساتھ لیے جا رہی ہوں!"

"پپا! بینش آج میرے ساتھ میرے بیڈ روم میں رہے گی۔ ہم دونوں خوب باتیں کریں گی' ہنسیں گی' بولیں گی۔ اچھے اچھے سہانے خواب دیکھیں گی۔ بنفشی سرمئی اور دودھیا رنگوں کے حسین بادلوں میں پریوں کے ساتھ اڑتی پھریں گی!"

"شٹ اپ! کیا بکواس ہے؟"

"اچھا تو پھر میں اس کے گھر جا رہی ہوں۔ صبح ناشتے کے وقت......"۔

"دولت بیٹا! کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ کہاں یہ بوریہ نشین لوگ اور کہاں ہم لوگ!"

"پپا! بینش میری دوست ہونے کے علاوہ آج سے وہ میری

بہن ہے اور میں اس کی بہن!"

"دولت! مجھے اب کچھ کرنا ہی پڑے گا! اوکے! گڈ نائٹ"۔

"ڈاکٹر صاحب! میری بینش کو بچالیں! میں پاگل ہوا جا رہا ہوں! مجھے کچھ پتا نہیں کیا کچھ بک رہا ہوں"۔

"حوصلہ رکھیں...... بس دعا کریں...... انتہائی ذہنی صدمہ پہنچنے سے بچی کی بیماری قابو میں نہیں آ رہی!"

"ڈاکٹر صاحب! پڑوس کے بنگلے کی امیر کبیر بچی اور میری بچی میں پکا بہناپا قائم ہو گیا تھا۔ سیٹھ صاحب کو یہ سخت ناپسند تھا۔ ایک مہینا ہوا وہ اپنے ساتھ امریکا لے گیا ہے!"

"بھائی! معاملہ اب اللہ ہی کے ہاتھ ہے...... وہی شفا بخشنے والا ہے!"

"بینش کہاں ہے بڑے بھائی؟"

"بڑا بھائی؟ کون بڑا بھائی؟"

"مذاق مت کریں! آپ کی بچی کہاں ہے؟"

کیوں سیٹھ صاحب! کیا بات ہو گئی؟"

"امریکا میں دولت' بینش کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکی۔ وہ برین ہیمرتج کا شکار ہو گئی! وہاں کے بہترین ڈاکٹروں' سرجنوں کا علاج کرایا مگر بے سود ان کی رائے میں بینش ہی اس کا واحد علاج ہے۔ اس وقت بھی بنگلے میں شہر کے چوٹی کے معالج موجود ہیں۔ مہربانی کر کے ذرا بینش کو بھیج دیں!"

"چلے جاؤ سیٹھ صاحب' یہاں سے چلے جاؤ! وہ کل عالم بالا کو سدھار چکی! میری بینش کے قاتل چلے جاؤ یہاں سے!"

"سیٹھ صاحب! اب کچھ باقی نہیں رہا! بس دعاؤں کی ضرورت ہے!"

"ہائے...... میری بچی دولت! اوہ! میرے خدا!"

☆☆☆

اگلے دن' قومی اخبارات میں یہ خبر جلی سرخیوں کے ساتھ چھپی کہ سیٹھ حبیب نے اپنی ساری جائیداد ملک بھر کی بارہ سال عمر تک کی بچیوں کے علاج و بہبود کے لیے وقف کر دی! ☆☆☆

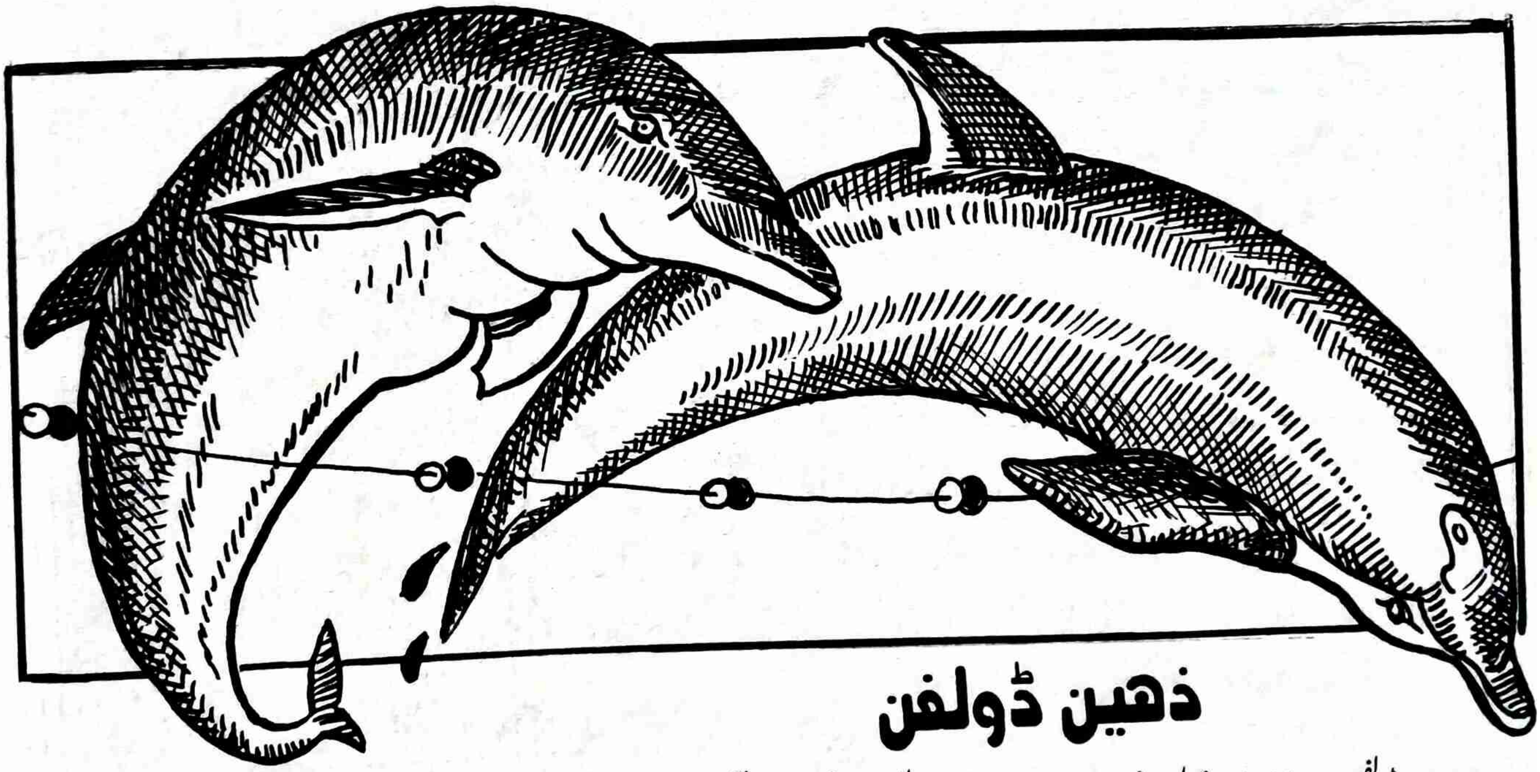

ذہین ڈولفن

ڈولفن بہت ذہین اور شاطر جانور ہے۔ امریکا میں ایک ڈولفن انسانی آواز کی نقل کرنے میں ماہر ہے۔ ایک دفعہ ایک جوڑا اس کے پاس سے آپس میں کسی بات پر ہنستے ہوئے جا رہا تھا کہ ڈولفن نے پانی میں سے آدمی کی نقل اتارتے ہوئے آواز نکالی۔ یہ سن کر اس کی بیوی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا تو ڈولفن نے بھی فوراً اس کی آواز میں ہو بہو ویسے ہی قہقہہ لگا دیا۔ یاد رہے کہ ڈولفن کبھی سوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ وہ صرف چند گھنٹوں کے لیے سوتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ باری باری ایک آنکھ کھلی اور دوسری آنکھ بند کر کے۔ ہے نا عجیب بات!

آئیے دوست بنائیں

صدر منیر 8 سال
فٹ بال کھیلنا
پبلک سکول اینڈ کالج
جوتیال۔ گلگت

محمد بلال شجاع 13 سال
ہاکی اور کرکٹ کھیلنا
B7' بلاک 10 فیڈرل بی ایریا
کراچی

واحد علی افضل 13 سال
کرکٹ کھیلنا
ڈاکخانہ تلہ گنگ۔ تحصیل تلہ گنگ
ضلع چکوال

ویس مظہر 12 سال
کرکٹ کھیلنا۔ تعلیم و تربیت پڑھنا
مکان نمبر E-46 گلی نمبر 2
بلاک A نشتر کالونی۔ لاہور

صابر علی 18 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا
مکان 9/25۔ 2660/رضا آباد
شاہ شمس روڈ۔ ملتان

قمر علی 15 سال
کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا
دشتی بازار۔ تربت
ضلع کیچ

سلمان اسلم 10 سال
کہانیاں پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا
237/e سیٹلائٹ ٹاؤن
بہاولپور

محمد کاشف مغل 15 سال
قلمی دوستی۔ پودے لگانا
خالد سعید کریانہ سٹور مین بازار
منچن آباد ضلع بہاولنگر

نعمان حیدر 18 سال
کمپیوٹر۔ قلمی دوستی
1755 اقبال روڈ
سپلائی۔ ایبٹ آباد

شعیب احمد 16 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا
مکان نمبر 1599 محلہ ملک پورہ
ہری پور ہزارہ

عاطف سلیم 14 سال
ٹیبل ٹینس کھیلنا
شاہین کالونی۔ باڑہ گیٹ
پشاور

کامران شفیق 10 سال
پرندے پالنا۔ کہانیاں سننا
مکان 233 گلی نمبر 3 پیپلز کالونی
اوکاڑا

محمد فاروق 18 سال
کرکٹ اور فٹ بال کھیلنا
محلہ زیارت آباد۔ ڈاکخانہ شکر درہ
تحصیل و ضلع کوہاٹ

ہارون افضل 9 سال
تعلیم و تربیت پڑھنا۔ کرکٹ کھیلنا
پنجگراں ڈاکخانہ علی پور فراش
تحصیل و ضلع اسلام آباد

فرقان اختر علوی 15 سال
مطالعہ۔ کمپیوٹر
کوارٹر نمبر D/24 لیبر کالونی نمبر 2
نشاط ملز۔ کھاریاں والا

عملش غفار 12 سال
کرکٹ اور کمپیوٹر
مکان D/1015 نزد پانی والی
ٹینکی محمد آباد۔ فیصل آباد

مدثر حسین انجم 15 سال
مطالعہ کرنا۔ کہانیاں لکھنا
338 کریم بلاک۔ علامہ اقبال
ٹاؤن۔ لاہور

حافظ زاہد حنیف قادری 16 سال
نعت خوانی۔ اسلامی کہانیاں پڑھنا
معرفت قاری محمد ارشد بمقام
کڑیانوالا۔ تحصیل و ضلع گجرات۔

عماد علی 13 سال
مطالعہ۔ کرکٹ کھیلنا
مکان 26A گلی نمبر 5
برکت پورہ شالامار ٹاؤن لاہور

وقاص احمد 15 سال
قلمی دوستی۔ مطالعہ
گلی نمبر 2 پیر غلام محی الدین کالونی
کمپنی۔ گوجرانوالا

محمد عادل توحید 12 سال
کرکٹ کھیلنا
مکان 17 گلی 15 قرشی سٹریٹ
لیاقت آباد۔ کوٹ لکھپت لاہور

محمد بہروز عبداللہ 18 سال
مطالعہ۔ فٹ بال کھیلنا
المحمد سٹریٹ۔ گلستان کالونی
گوجرانوالا

آئیے دوست بنائیں کے لیے یہ کوپن پر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں)

نام.................. عمر..................
مشاغل......................................
پتا...

میرا باغ

1

قاضی سمیع اللہ، بنوں (پہلا انعام: 100روپے کی کتابیں)

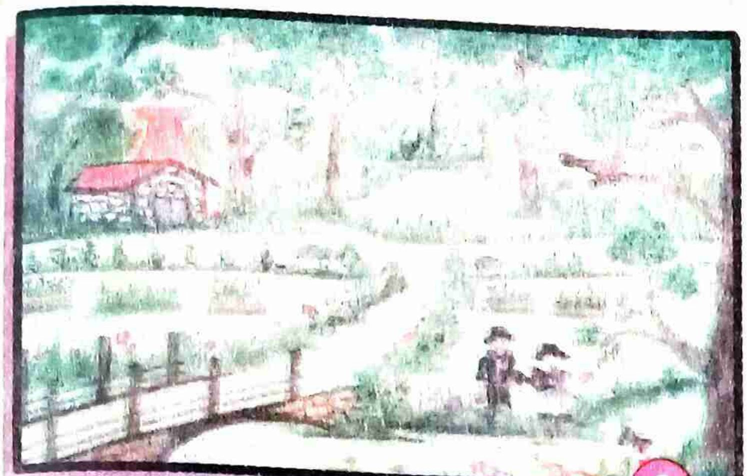

2

راشد علی مجاہد، لاہور (دوسرا انعام: 75روپے کی کتابیں)

3

شاہ زیب علی، کراچی (تیسرا انعام: 50روپے کی کتابیں)

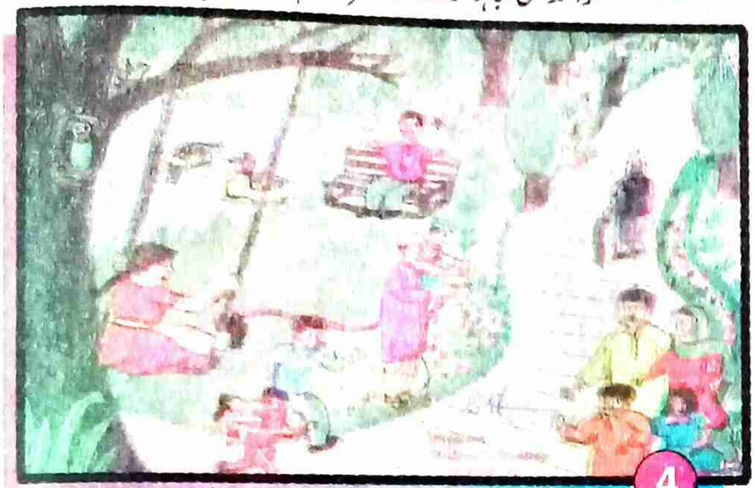

4

اویس احمد، ساہیوال (چوتھا انعام: 45روپے کی کتابیں)

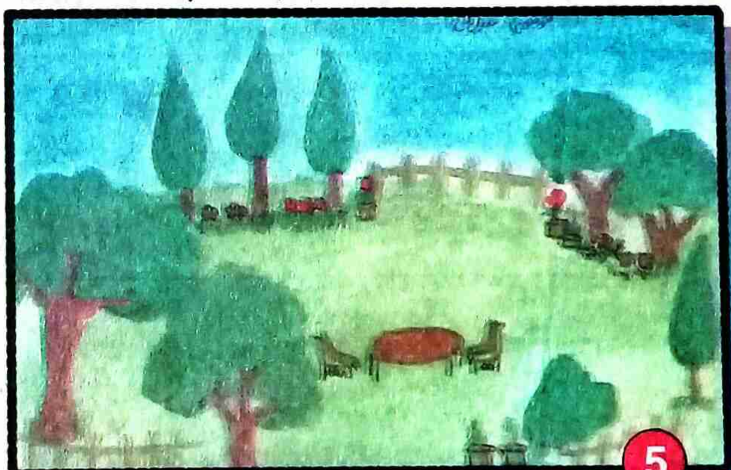

5

اسماء مقصود، راولپنڈی (پانچواں انعام: 40روپے کی کتابیں)

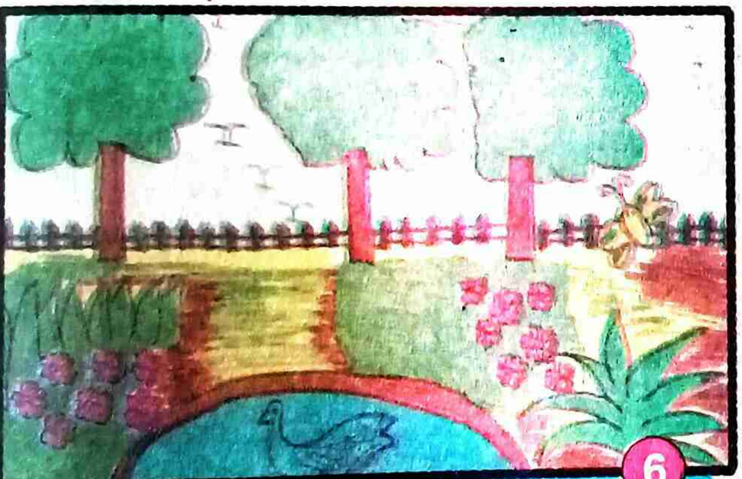

6

فاطمہ جمال، لیہ (چھٹا انعام: 35روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:۔ علی طاہر سیالکوٹ۔ عبیدالرحمان کسووال۔ احمد بلال راولپنڈی۔ محمد تاجور قیوم راولپنڈی۔ آسیہ رحمان لاہور۔ اسرا معین لاہور۔ مرینہ سجاد مظفر گڑھ۔ اویس احمد جوئیہ ساہیوال۔ محمد شہاب راولپنڈی۔ شکیل الرحمان حویلی بہادر شاہ۔ جہانزیب علی سید کسووال۔ رابعہ میاں محمد لاہور۔ سعدیہ سردار راولپنڈی۔ اسمارہ ندیم لاہور۔ نورین ظفر حیدر آباد۔ حمزہ بلال لاہور۔ احمد خان کوٹ ڈیجی۔ نعیمہ سلیم شکار پور۔ محمد جلال کوئٹہ۔ نعمان حمید پشاور۔ محسنہ علی آزاد کشمیر۔ توقیر احمد ملتان۔ باغ علی بنوں۔ سلیمہ گوہر فیصل آباد۔ کامران علی خان کراچی۔ احمد علی کوٹری۔ نورین عمران لاہور۔ اقبال علی ساہیوال۔

دسمبر کا موضوع:
سردی آئی

آخری تاریخ 10 نومبر

جنوری کا موضوع:
میرا اسکول

آخری تاریخ 10 دسمبر

ہدایات: تصویر 6انچ چوڑی، 9انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت میں مصور اپنا نام، عمر، کلاس، اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

قسط نمبر 11

نیٹ ورک

دس لاکھ کا سوٹا

منظر رضا ہاشمی

رات کا وقت تھا۔ تفریحی پارک میں چاروں طرف رونق تھی اور ہر طرف ہنستے مسکراتے لوگ اپنے بچوں کو ہمراہ لیے چہل قدمی میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ کینٹین پر بیٹھے مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ماحول خاصا خوشگوار تھا اور موسم بھی۔ اِدھر ادھر گھومتے پھرتے لوگوں میں طاہر اور طیب بھی گداگروں کے روپ میں موجود تھے۔ طاہر نے بیساکھیاں پکڑ رکھی تھیں اور طیب ٹانگوں پر پٹیاں باندھے کسی لولے لنگڑے بھکاری کی طرح گھسٹتا پھر رہا تھا۔ دونوں انتہائی درد بھری آواز نکال کر لوگوں سے خیرات مانگ رہے تھے۔ طیب کو تو بری طرح شرم محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا سارا جسم گرد سے اٹا ہوا تھا۔

لیکن مرتا کیا نہ کرتا مجرموں کو تو بہرحال تلاش کرنا ہی تھا۔ لوگ ترس کھا کر دھڑادھڑ پیسے دے رہے تھے۔ اسی طرح وہ لوگوں سے خیرات لیتا ہوا آخری لان تک پہنچ گیا جہاں آخری سرے پر بیٹھے ہوئے چھ کے قریب افراد سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ طیب گھٹنوں کے بل چلتا ہوا وہاں تک پہنچ گیا۔ ”اللہ کے نام کا سوال ہے بابا‘ معذور آدمی ہوں دعا دوں گا“۔ طیب نے اپنے گلے سے انتہائی گلوگیر آواز نکالتے ہوئے کہا۔ اس کی اداکاری میں حقیقت کا اس قدر گہرا رنگ تھا کہ جیسے وہ کئی نسلوں سے بھکاری چلا آرہا ہو جبکہ اس کی آنکھیں کسی ماہر سراغ رساں کی طرح ان چھ افراد کے چہروں‘ آوازوں اور دیگر حرکات و سکنات کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ راحت حسین نے ان افراد کے بارے میں جو اشارے دیئے تھے۔ ان کے مطابق یہ لوگ دہشت گرد ہی لگتے تھے۔ ویسے قدوقامت اور شکل سے بھی یہ لوگ جرائم پیشہ دکھائی دیتے تھے۔ جونہی طیب نے خیرات مانگی ایک آدمی بھڑک اٹھا۔ ”چلو بھاگ جاؤ۔ کان مت کھاؤ“ اتنے میں طاہر بھی دوسرے کونے سے ہوتا ہوا یہاں پہنچ گیا اور اس نے بھی آواز لگانا شروع کر دی:

”اللہ بھلا کرے گا جی غریب لوگ ہیں کھانے کو ترس رہے ہیں“ طاہر نے یوں کہا جیسے وہ ابھی رو پڑے گا۔ ”دے دو یار کچھ ان معذوروں کو ورنہ ایسے ہی خواہ مخواہ کان کھاتے رہیں گے“۔ ان میں سے ایک آدمی نے دوسرے سے مخاطب ہو کر کہا۔ دوسرے آدمی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چند سکے نکالے اور حقارت سے ان کی طرف بڑھا دیئے۔ سکے لینے کے بعد دونوں علیحدہ علیحدہ ہو کر اسی طرح مختلف لوگوں سے بھیک مانگتے ہوئے پارک کے دوسرے سرے پر جا کر اکٹھے ہو گئے۔ دونوں نے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے اور طاہر بیساکھیوں کا سہارا لیتا ہوا ایک طرف موجود واش روم میں داخل ہو گیا۔ اُس نے واش روم کا دروازہ بند کیا اور موبائل پر راحت حسین سے رابطہ کیا جو پارک سے باہر فورس کے ساتھ موجود تھے۔

"ہم لوگ ابھی پہنچ رہے ہیں"۔ راحت حسین نے جواب دیا اور اس کے ساتھ ہی رابطہ آف ہو گیا۔ طاہر نے واش روم سے باہر نکل کر دیکھا۔ اردگرد کوئی بھی آدمی موجود نہیں تھا۔ وہ ایک بڑے سے پودے کے عقب میں چلا گیا۔ اس نے وہاں اپنی بیساکھیاں چھپا دیں اور گداگری والا لباس اتار کر وہیں چھپا دیا۔ نیچے اس کی پینٹ شرٹ موجود تھی۔ اب وہ اپنے اصل ڈریس میں انتہائی خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے ایک طرف لگے ہوئے شاور سے منہ ہاتھ دھویا۔ اس طرح اس کے منہ اور ہاتھوں پر لگی ہوئی مٹی صاف ہو گئی اور وہ فریش ہو گیا۔ جب وہ اس جگہ پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ طیب بھی ایک پودے کی آڑ سے نکل کر آرہا ہے۔ اس نے بھی پاؤں پر بندھی ہوئی پٹیوں اور پھٹے پرانے گداگروں والے لباس سے جان چھڑا لی تھی اور اب وہ اپنے اصل حلیے میں موجود تھا۔ اس کے بعد دونوں دوڑتے ہوئے پارک کے اس حصے کی طرف گئے جہاں انہوں نے کمانڈوز کو انتہائی سرعت سے لان کو گھیرے میں لیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ "ہیلو...... تم اس لان میں جو چھ افراد موجود ہو۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ تمہارے اردگرد ہر طرف کمانڈوز موجود ہیں۔ اگر تم نے حرکت کی تو گولیوں سے بھون دیئے جاؤ گے"۔ راحت حسین نے ان دہشت گردوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ان دہشت گردوں کے بھاگنے سے پہلے ہی کمانڈوز بھوکے عقابوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں میں چھ کے چھ ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے کمانڈوز کے گھیرے میں پارک سے باہر لائے گئے۔ کمانڈوز کی سپیشل بلٹ پروف گاڑیاں انہیں لے کر نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گئیں۔ یہ آپریشن اتنی سرعت سے مکمل ہوا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنے بڑے دہشت گرد چند ثانیوں میں گرفتار کر لیے جائیں گے۔

زیاد اس وقت باؤلے کتے کی طرح تہہ خانے میں بھاگ رہا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اپنے بال نوچے یا دیواروں سے سر ٹکرائے۔ اس وقت یوں لگ رہا تھا جیسے وہ مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہو۔ اسے حاذق کی گرفتاری بری طرح کھٹک رہی تھی کہ اس دوران سیکشن نمبر تھری کے تمام کارندوں کی گرفتاری کی خبر آ گئی۔ کافی دیر تک وہ بدحواسی کے عالم میں تہہ خانے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے کالنگ مشین کے پاس پہنچ کر مختلف بٹن آف آن کرنے شروع کر دیئے۔ تھوڑی سی دیر بعد اس کا رابطہ بحال ہو گیا۔ "ہیلو حارب بول رہا ہوں" رابطہ ہوتے ہی دوسری طرف سے آواز آئی۔ زیاد بول رہا ہوں۔ میں نے تمہیں حکم دیا تھا کہ انٹیلی جنس کا پورا ہیڈ کوارٹر اڑا دو۔ ابھی تک اس کی تباہی کی رپورٹ مجھ تک کیوں نہیں پہنچی؟ تم لوگ مر چکے ہو کیا؟" "باس ایک تو سیکورٹی کے انتظامات انتہائی سخت ہیں ہم نے بڑی مشکل سے اس عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ ابھی آج ہم اس پر حملے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ آپ کی کال آ گئی" دوسری طرف سے حارب نے مودبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"تم ایسا کرو کہ ایک کار بارود سے بھر لو۔ اسے تم نے خود ڈرائیو کرنا ہے۔ دوسری کار میں اپنے کِلنگ سکواڈ کے چار منجھے ہوئے ایجنٹ بٹھا لو اور تیسری کار میں میں خود تم سب کو کور دوں گا۔ تم نے پہلی کار کو انٹیلی جنس کی عمارت سے ٹکرا دینا ہے لیکن عمارت سے ٹکرانے سے پہلے ہی تم نے چھلانگ لگا کر اپنے آپ کو بچا لینا ہے۔ جونہی یہ کار عمارت سے ٹکرائے گی ہر طرف بھگدڑ مچ جائے گی۔ اس بھگدڑ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہارے چاروں ایجنٹ اندر گھس جائیں گے۔ واپسی پر جو بھی تم میں سے فرار ہونا چاہے گا وہ میری کار تک پہنچ جائے گا۔ اس طرح ہم صحیح سلامت بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے"۔ زیاد نے حارب کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

رات انتہائی گہری ہو چکی تھی اور چاروں طرف گھبیر اندھیرا چھایا ہوا تھا کبھی کبھار کسی طرف سے کسی الو کے چیخنے کی آواز فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتی اور اس کے بعد پھر چار سو خاموشی

چھا جاتی۔ انٹیلی جنس دفاتر کی عمارت بھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس تاریکی میں بھی اس کے چاروں طرف نصب خفیہ کیمرے ہر آنے جانے والی گاڑی کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایسے میں انٹیلی جنس دفاتر کے عین سامنے والی عمارت کی اوپر والی منزل پر طاہر اور طیب سیاہ رنگ کے لباس پہنے جس کے اندر انہوں نے بلٹ پروف جیکٹیں پہن رکھی تھیں، ہاتھوں میں نائٹ ٹیلی سکوپس لیے موجود تھے۔

"طیب! ٹیلی سکوپ ادھر بائیں طرف کرو۔ وہ دیکھو دور سڑک پر ادھر دو کاریں آتی دکھائی دے رہی ہیں"۔ طاہر نے کہا اور طیب نے فوراً ہی ٹیلی سکوپ کا رخ اس طرف کر دیا۔

"اوہ واقعی دو کاریں بہت تیزی سے اس طرف آرہی ہیں۔ لیکن ان کی چھت پر چمکیلی لہریں سی کیوں نظر آرہی ہیں" طیب نے حیرت سے کہا۔

"یہ کچھ قریب آجائیں تو تب پتا چلے گا۔ طاہر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا جبکہ اس کی ٹیلی سکوپ کا رخ اسی طرف تھا۔ "اوہ یہ تو شاید کسی شادی وغیرہ کی کاریں ہیں۔ ان کی چھتوں پر کھڑکیوں پر سجاوٹ کے پھول اور عروسی سہرے نظر آرہے ہیں" جونہی کاریں کچھ قریب آئیں، طاہر نے حیرت سے کہا۔

"مگر بارات میں تو کئی کاریں ہوتی ہیں اور پھر رات کے اس پہر ان کے آنے کا کیا تک بنتا ہے" طیب نے قدرے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں میرے خیال سے یہ شادی ہی کی کاریں ہیں" طیب نے منہ بناتے ہوئے کہا اور ٹیلی سکوپ سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ جبکہ طاہر بدستور انہی کاروں کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ اب کاریں اس قدر نزدیک آگئیں کہ طاہر نے ٹیلی سکوپ کو ایک طرف رکھ دیا۔ دونوں کاریں تیزی سے سڑک عبور کرنے لگیں۔ پھر اچانک طاہر اور طیب چونک پڑے۔ کیونکہ ان میں ایک گاڑی کا رخ تبدیل ہو گیا اور یہ انٹیلی جنس دفاتر کی طرف مڑ گئی۔ پھر اس میں سے ایک آدمی نے بجلی کی سی تیزی سے چھلانگ لگائی اور سڑک پر رول ہوتا چلا گیا۔ "کاشن دو واردات ہو گئی ہے"۔ طاہر نے چیختے ہوئے کہا اور طیب نے ساتھ رکھے ٹرنچ فائر پسٹل سے ہوا میں فائر کیا تو اوپر ستارے سے بکھرتے چلے گئے۔ یہ راحت حسین کے لیے کاشن تھا کہ دہشت گرد یہاں پہنچ چکے ہیں۔ مگر شاید انہیں دیر ہو گئی تھی یا شاید واردات کا انداز ان کی توقع کے بالکل برعکس تھا کیونکہ ٹرنچ فائر ہوتے ہی اگلی کار انتہائی خوفناک دھماکے سے انٹیلی جنس کی عمارت سے ٹکرائی اور چاروں طرف سے گردوغبار کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ دھماکے میں اس قدر شدت تھی کہ طاہر اور طیب کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے پوری کائنات ریزہ ریزہ ہو کر روئی کے گالوں کی طرح فضا میں بکھر گئی ہو۔

دھماکے کی شدت سے ایک لمحے کے لیے تو طاہر اور طیب سن ہو کر رہ گئے۔ انہیں سمجھ ہی نہ آیا کہ یہ کیا ہو گیا ہے۔ دھماکہ خیز مواد اس قدر طاقت ور تھا کہ عمارت کے ساتھ والی دیوار بھی دھماکے سے نیچے آگری تھی۔ ہر طرف گرد ریت اور سیمنٹ کے بادل اٹھتے چلے گئے۔ دوسرے ہی لمحے طاہر نے اپنے اعصاب کو سنبھالا اور ساتھ پڑی ہوئی مشین گن اٹھا لی۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سے چھلانگ لگانے والے اس آدمی کو تاڑ لیا تھا جو پہلے رول ہوتا ہوا سڑک پر گرا اور اب زگ زیگ ہوتا ہوا بھاگتا چلا جا رہا تھا۔ شاید مجرم نے بھی گولیوں کی سنسناہٹ کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے چھلانگ لگا کر ایک دکان کے ستون کی آڑ لینے کی کوشش کی مگر چند گولیاں اس کی ٹانگوں کو بہر حال چھو گئیں۔ نیچے مجرم ستون کی آڑ میں ہو چکا تھا اور ادھر طاہر اور طیب چار منزلہ عمارت کے اوپر موجود تھے۔ اس کار میں سے چھ کے قریب آدمی نکلے۔ انہوں نے مارٹر گنوں سے عمارت پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

ادھر طاہر اور طیب نے گنیں سیدھی کر کے ان لوگوں پر فائرنگ شروع کر دی۔ کیونکہ یہ لوگ براہ راست ان کے ٹارگٹ پر تھے اس لیے چھ میں سے تین آدمی پہلی فائرنگ میں ہٹ ہو گئے اور تڑپتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گئے۔

اتنے میں باقی تین افراد میں سے ایک نے اپنی جیکٹ میں سے سموک بم نکال کر زمین پر مارا تو دھوئیں کے مرغولے سے اڑے اور چاروں طرف پھیل گئے۔ دھواں اتنا کثیف تھا کہ انٹیلی جنس کی پوری عمارت دھوئیں میں چھپ گئی۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس بھگدڑ کی وجہ سے وہ چند ثانیوں کے لیے اس تیسری کار کو بھول گئے جو ان دو کے پیچھے آ رہی تھی۔ اتنے میں تیسری کار بھی اس جگہ پہنچ گئی۔ اس میں سے ایک چوڑی نالی سی برآمد ہوئی جیسے کوئی چھوٹی توپ ہو۔ "پیچھے ہٹو' ورنہ ہٹ ہو جاؤ گے" طاہر نے یکلخت چیختے ہوئے کہا۔ طاہر اور طیب پیچھے اچھلے اور لفٹ میں جا گرے۔ طاہر نے گرنے کے ساتھ ہی لفٹ کے اندر لگے سوئچ بورڈ کا بٹن دبا دیا تھا۔ ان کے جسم لفٹ کے فرش سے چھوئے ہی تھے کہ لفٹ جھٹکا کھا کر نیچے اترتی چلی گئی۔ عین اسی لمحے زور دار دھماکہ ہوا اور وہ تمام شیڈ جس پر چند لمحے پہلے طاہر

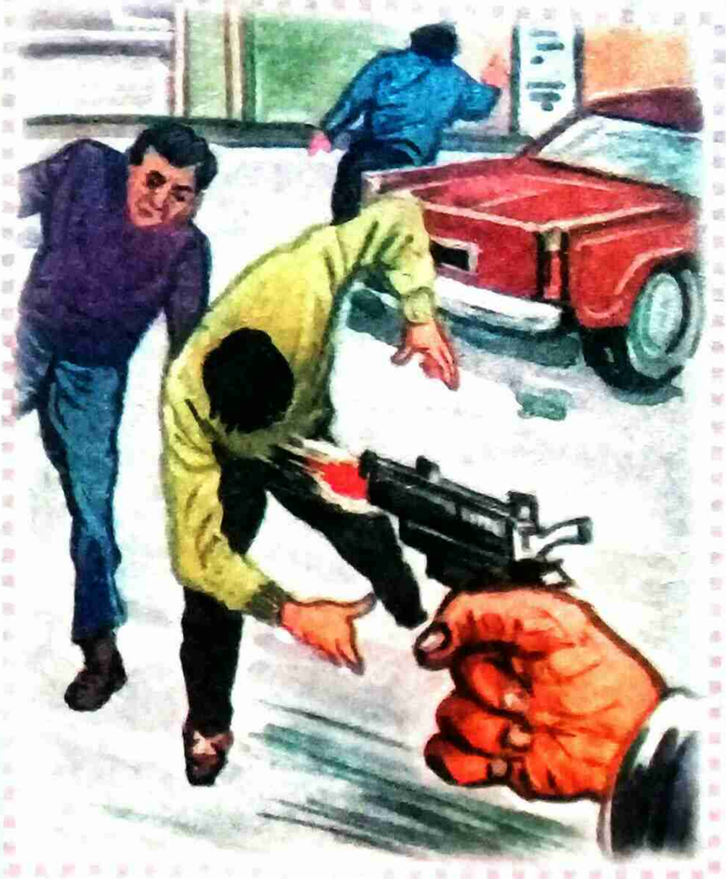

اور طیب موجود تھے ریت کے ذروں کی طرح فضا میں اڑ گیا۔ اگر وہ محض ایک لمحے کی بھی دیر کرتے تو اب تک ان کے پرخچے اڑ چکے ہوتے۔ لفٹ نے چند ثانیوں میں انہیں گراؤنڈ فلور پر پہنچا دیا۔ عمارت میں اب فائرنگ رک چکی تھی صرف دھوئیں کے مرغولے اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

اچانک طاہر کی نظر اس ستون پر پڑی جہاں سب سے پہلے آدمی کو فائر کیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ تیسری کار میں سے ایک آدمی نکل کر تیزی سے اس ستون کی طرف بڑھ رہا ہے۔ طاہر نے برق رفتاری سے جیکٹ کی جیب سے لانگ رینج پسٹل نکالا اور پے در پے فائر کر دیئے۔ وہ اس تیسری کار والے مجرم کو ہٹ کرنا چاہتا تھا جس کے بارے میں اس کا اندازہ تھا کہ تمام گروپ کو لیڈ کرنے والا وہی آدمی ہے۔ مجرم دراصل اپنے زخمی آدمی کو اٹھا کر کار میں ڈالنا چاہتا تھا۔ جونہی طاہر نے فائر کیے' تیسری کار والا آدمی بجلی کی سی تیزی سے واپس کار کی طرف پلٹا۔ پھر اس کی کار ایک جھٹکا کھا کر آگے بڑھتی چلی گئی۔ وہ طاہر کی فائرنگ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کا زخمی ساتھی ایک ستون کی آڑ میں بیہوش پڑا ہے۔

دہشت گرد چونکہ زخمی تھا اس لیے اسے فوری طبی امداد کی

ضرورت تھی تاکہ اس کی جان بچائی جا سکے اور اس سے معلومات حاصل کی جاسکیں۔

راحت حسین کے چہرے پر کرختگی اور غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ان کے سامنے انٹیلی جنس کے چار انسپکٹر کھڑے تھے۔ "میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ صرف چھ سات دہشت گردوں نے انٹیلی جنس کی اتنی بڑی عمارت کو تنکوں کی طرح اڑا دیا۔ آخر کس نے دہشت گردوں کو یہاں کے حفاظتی انتظامات کی تفصیل بتائی؟ اگر میں اور انسپکٹر سعید ہمت سے کام نہ لیتے تو وہ اور بھی تباہی پھیلا دیتے۔ ادھر سے طاہر اور طیب نے بھی ہمت کی۔ اس طرح یہ چھ کے چھ دہشت گرد مارے گئے اور ساتواں زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن میں یہ پوچھتا ہوں کہ دہشت گردوں کو اس عمارت اور حفاظتی انتظامات کے بارے میں مطلع کس نے کیا؟ ایک نہ ایک تو ہم میں سے ضرور غدار ہے"۔ راحت حسین گرجتے ہوئے بولے۔

تمام انسپکٹر سر جھکائے کھڑے تھے۔ انسپکٹر طفیل کا چہرہ بالکل بجھا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے سراسیمگی نمایاں تھی۔

"انسپکٹر سعید! تم وہ سارے پروف انسپکٹر طفیل کے سامنے پیش کرو۔ تاکہ بعد میں اسے شکوہ نہ رہے کہ اسے ناجائز سزا دی

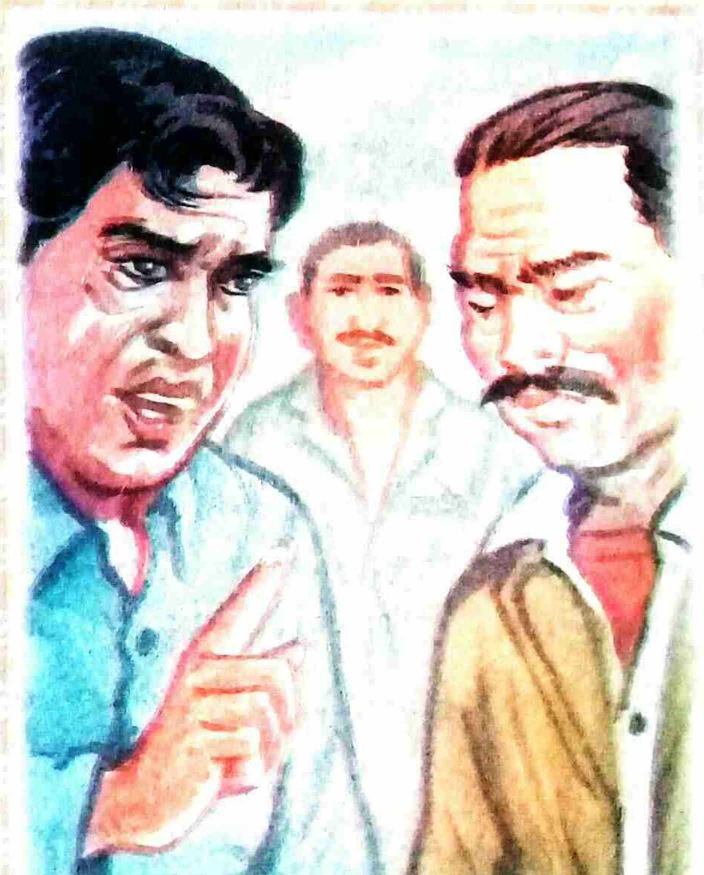

گئی۔ اسے وہ ٹیپ بھی سنواؤ جس میں اس نے دہشت گردوں کو انٹیلی جنس کے بارے میں تفصیلی معلومات دینے کے عوض دس لاکھ روپے لیے اور اسے اس کا غیر ملکی اکاؤنٹ نمبر بھی بتاؤ جس میں اس نے یہ ساری رقم کل ہی جمع کرائی تاکہ باقی انسپکٹرز بھی دیکھ لیں کہ ان کی صفوں میں ایک ملک دشمن، ضمیر فروش اور غدار انسان موجود ہے"۔ راحت حسین چیختے ہوئے بولے۔ انسپکٹر سعید نے ٹیپ ریکارڈر نکالا اور کیسٹ لگا کر بٹن آن کر دیا۔ ٹیپ چلنے لگا اور اس میں باری باری سب کالیں سنائی دینے لگیں جو دہشت گردوں کے سربراہ زیاد اور انسپکٹر طفیل کے درمیان ہوئی تھیں۔ پھر آخری کال بھی آگئی جس میں زیاد نے دس لاکھ روپے اس کے اکاؤنٹ میں پہنچنے کی اطلاع دی تھی۔ یہ سنتے ہی انسپکٹر طفیل نے تیزی سے چھلانگ لگائی اور کمرے سے فرار ہونے کی کوشش کی مگر دس کے قریب کمانڈوز جو راحت حسین نے کمرے کے باہر تعینات کر رکھے تھے انہوں نے نہ صرف انسپکٹر طفیل کو دھکا دے کر واپس کمرے میں پھینک دیا بلکہ ریوالور نکال کر اسے غیر مسلح بھی کر دیا۔

"اب انسپکٹر طفیل! تم اپنی یونیفارم اتار دو کیونکہ اس وقت تم قومی مجرم ہو اور اب تم ہمیں یہ بتاؤ کہ یہ سارا نیٹ ورک کس طرح کام کر رہا ہے؟ مجرم کس طرح اپنے ٹھکانے' گاڑیاں اور موبائل تبدیل کرتے رہے۔ زیاد کا اصل ٹھکانا کہاں ہے؟ اب میں تمہاری رگ رگ سے یہ ساری معلومات نچوڑ لوں گا"۔

"اسے آپریشن روم میں لے چلو۔ جو دہشت گرد زخمی حالت میں طاہر اور طیب کے ہاتھ آیا ہے اسے بھی آپریشن روم میں پہنچا دو"۔ راحت حسین نے تحکمانہ لہجے میں انسپکٹر سعید سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اوکے سر" انسپکٹر سعید نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔ اب راحت حسین کو اصل پریشانی زیاد کے بارے میں تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک زیاد کا خاتمہ نہیں ہوتا' دہشت گردوں کے نیٹ ورک کو نہیں توڑا جا سکتا۔ اب وہ جلد از جلد زیاد پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے۔

(دہشت گردوں کا سرغنہ کس طرح اپنے انجام کو پہنچا؟ یہ جاننے کے لیے اگلے ماہ آخری قسط پڑھنا نہ بھولیے گا!) ☆☆☆

بلاعنوان

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 نومبر 2003ء

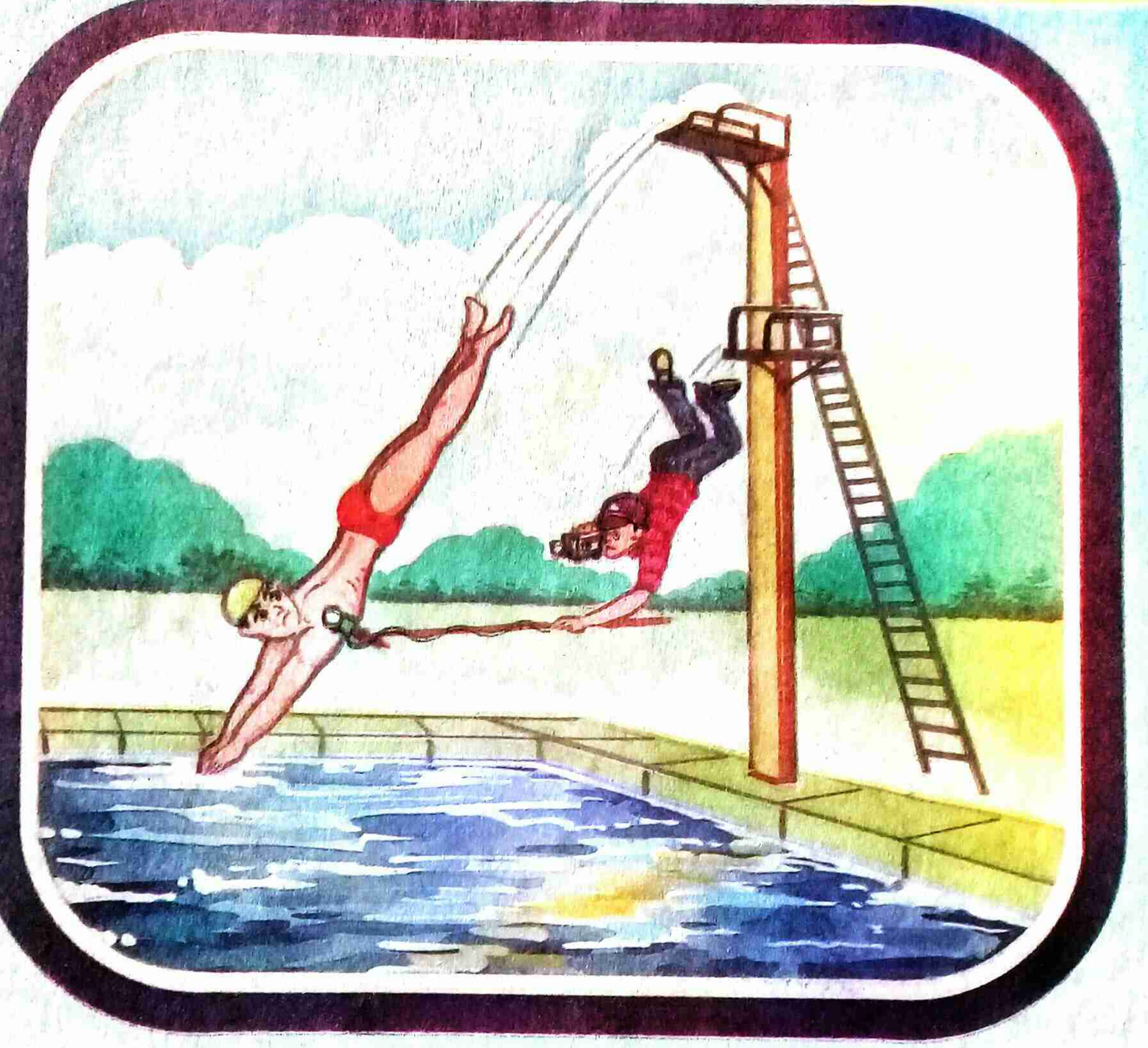

اکتوبر 2003ء کے "بلاعنوان کارٹون" کے لیے بے شمار عنوان موصول ہوئے جن میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل 6 عنوانات پسند آئے اور ان کے مطابق یہ 6 ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

☆ سیدہ ثوبیہ گوہر' کراچی ("وقت کی چڑیا پنجرے میں آجا": پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

☆ حمزہ خالد' لاہور ("نہ رہے گی چڑیا نہ بجیں گے سات" دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)

☆ طہٰ یاسین' حیدر آباد ("میں کوئی سونے کا انڈا دینے والی چڑیا نہیں" تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

☆ فاطمہ طاہرہ' ٹیکسلا ("آؤ گھر بدلیں!" چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

☆ محمد ارزم ہاشمی' لاہور ("کاش وقت کا پنچھی قید ہو جائے" پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)

☆ محمد سمیع اللہ' جوہر آباد ("لڑکا چھوٹا عقل کا موٹا": 60 روپے کی کتابیں)